موضوع پر کتاب علمی اور محققانہ ہے، عام لوگون کے علاوہ اطبا کے لئے بھی اسکا مطالعہ مفید ہے،

**رضا شاہ پہلوی**، مولفہ جناب محمد اشرف خان صاحب تقطیع چھوٹی، ضخامت ۶۰ صفحے،

کاغذ، کتابت و طباعت بہتر قیمت ۶؍ پتہ:۔ مکتبۂ اردو لاہور

اس کتاب مین رضا شاہ پہلوی کے مختصر حالات ہین، قاچاری دور کے ایران کی حالت دکھانے کے بعد اس کی تجدید و ترقی مین رضا شاہ کے مساعی اور کارنامون پر روشنی ڈالی گئی ہے، اور ان کے دور کے فوجی، تعلیمی، سلسلہ رسل و رسائل، دوسری قومون سے معاہدون اور دوسرے سیاسی اور اصلاحی کارنامون اور ترقیون پر مختصر تبصرہ ہے، آخر مین معزولی کا ذکر ہے، رضا شاہ کی شخصیت اور کارنامون کے مقابلہ مین یہ کتاب نہایت مختصر اور ناکافی ہے، اور اس کی حیثیت ایک مضمون سے زیادہ نہین تاہم کچھ نہ ہونے کے مقابلہ مین غنیمت ہے،

**فارسی بھگوت گیتا**، مرتبہ جناب محمد شفیع صاحب کنبوہ، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۲۳۲ صفحے، کاغذ

نفیس، کتابت و طباعت بہتر قیمت معلوم نہین، پتہ:۔ ایم ایس کنبوہ، خیالستان، گڑھی شاہو لاہور

ہندوستان کی مشہور و مقدس کتاب بھگوت گیتا کا سب سے پہلا منظوم فارسی ترجمہ غالباً فیضی نے کیا لیکن اس مین محققین کا اختلاف ہے، کہ موجودہ جو ترجمے پائے جاتے ہین، وہ درحقیقت فیضی ہی کے ہین یا کسی اور کے، یہ ترجمہ اس سے پہلے بھی چھپ چکا ہے لیکن نہایت مسخ اور غلط تھا، اس لئے جناب محمد شفیع صاحب نے صحت اور طباعت کے اہتمام سے اسے دوبارہ مرتب کرکے شائع کیا ہے، کتاب کے شروع مین گیتا کے منظوم ترجمہ کے مختلف نسخون کا ذکر کرکے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ یہ ترجمہ فیضی ہی کا ہے، اور گیتا کے موضوع اور مضامین پر مختصر تبصرہ ہے، اصل کتاب دو سو صفحون مین ہے، یہ ترجمہ ایک تاریخی یادگار کی حیثیت سے قابل قدر اور جن لوگون کو ہندو تصوف اور ویدانت سے دلچسپی ہو ان کے ذوق کی چیز ہے،

"م"

"جلد ۵۰" ماہ رمضان المبارک سنہ ۱۳۶۱ھ مطابق ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۴۲ء "عدد ۴"

## مضامین

# شذرات

۲۰ شعبان سنہ ۱۳۶۱ھ کو صوبہ بہار کے مشہور و ممتاز کہنہ مشق شاعر حافظ فضل حق آزاد عظیم آبادی نے اس دنیائے دوں کو الوداع کہا، مرحوم کی عمر اس وقت غالباً اسی سے زیادہ ہوگی کانوں سے اونچا سننے لگے تھے، مگر اس سن و سال میں بھی ان کی شاعری کے شباب کا وہی عالم تھا، غزلوں کے کہنے کا اتفاق کم ہوتا تھا، مگر قومی و علمی و اخلاقی اور فلسفیانہ نظموں کا شوق زیادہ تھا، زیادہ تر اردو میں اور کبھی کبھی فارسی میں کہتے تھے، اور شاذ و نادر عربی میں بھی طبع آزمائی کی نوبت آجاتی تھی،

پٹنہ میں سرسید مرحوم کی تعلیمی و قومی تحریک کے علمبردار قاضی رضا حسین صاحب مرحوم تھے، یہ ان کے حیدرآباد کے وفد کے ایک رکن بھی تھے، قاضی صاحب مرحوم کی فیض بخش علمی صحبتوں میں بہار کے جو چند نوجوان ابھرے، بڑھے اور پھیلے اُن میں ایک نام حافظ آزاد مرحوم کا بھی ہے، چنانچہ سرسید مرحوم کے اس سنہ ۱۸۹۱ء والے حیدرآبادی وفد میں جس کے دوسرے ممبر مولانا شبلی نعمانی اور مولانا حالی وغیرہ تھے، قاضی رضا حسین صاحب کے ساتھ آزاد مرحوم بھی تھے،

میں نے ان کو سب سے پہلے سنہ ۱۹۰۰ء میں جب میری نوعمری تھی ندوہ کے اجلاس پٹنہ میں اپنا ترکیب بند پڑھتے سنا، بلند قد، اونچی آواز، خود اعتمادی کے تیور، لہجہ پُرجوش، کٹہرے میں شیر کی گرج سی سنائی دیتی تھی، سامنے علماء و مشائخ کی صفیں تھیں جن کی تعداد کئی سو سے کم نہ ہوگی، اکثر کی نورانی شکلوں کی یاد اب بھی دل کو منور کرتی ہے، شاعر نے جب ان کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرکے یہ شعر پڑھا ہے،

نشانِ کاروانِ رفتہ ہیں دل کے اجالے ہیں　　غنیمت ہی غنیمت ہیں کہ سب اللہ والے ہیں



تحسین و آفرین کی آوازوں سے ساری فضا گونج گئی تھی، اسی جلسہ میں آغا سنجر طہرانی بھی تھے اور انھوں نے بھی اپنا وہ فارسی قصیدہ پڑھا تھا جس کا مطلع تھا

ستایش می سزد البتہ یکتا ذاتِ یزداں را　　کہ او از نطق تشریف شرف بخشید انساں را

مولانا شبلی مرحوم سے ان کی ملاقات اسی عہد جوانی کی تھی، مولانا مرحوم نے جن دنوں سنہ ۱۹۰۰ء میں اپنی اُن فارسی غزلوں کا سلسلہ شروع کیا تھا جو بوئے گل اور دستہ گل کے نام سے چھپ چکی ہیں، اور ملک میں اُن غزلوں کا پُرجوش خیر مقدم کیا جا رہا تھا، اور اہلِ سخن ان کے جواب میں غزلیں لکھا کرتے تھے تو ان میں سے ایک حافظ صاحب مرحوم بھی تھے، غالباً یہی سنہ تھا مولانا مرحوم کلکتہ سے لوٹ کر پٹنہ میں مولوی خدا بخش خاں مرحوم (کتبخانہ والے) کے یہاں ٹھہرے تھے، خاکسار بھی حاضر تھا، اتنے میں مولانا سے ملنے حافظ صاحب مرحوم بھی آگئے، اس زمانہ میں مولانا کی ایک فارسی غزل نئی نئی "شاق افتادہ بود، طاق افتادہ بود" نکلی تھی، وہ مولانا نے ان کو سنائی، انھوں نے بعد کو اس کا جواب لکھا، سب سے آخری دفعہ وہ سنہ ۱۹۲۶ء کے اجلاسِ ندوہ کانپور میں جس کے صدر حکیم اجمل خاں مرحوم تھے ادھر آئے تھے، اور اپنی ایک نظم پڑھی تھی،

مرحوم فطری شاعر تھے، کسی استاد سے کبھی اصلاح نہیں لی، مشکل قافیوں اور ردیفوں کا بھی شوق تھا، زبان و محاورات و روزمرہ کے بجائے دقیق مضامین و معانی کا شوق زیادہ تھا، اسی لئے مشکل الفاظ سے پرہیز نہ تھا، طبیعت میں ذکاوت و ذہانت تھی، اور اپنے لئے آپ راستہ پیدا کرنے کی دھن تھی، تقلید عام سے نفور تھے، جوانی میں شاد عظیم آبادی سے بھی بھڑتے رہتے تھے، اور اسٹیج میں مذاقیہ داد نظم بھی دیتے تھے، ادھر مدت سے خانہ نشین تھے، باہر کی آمد و رفت بند تھی، کبھی کبھی ایک آدھ نظم کسی رسالہ میں نکل جاتی تھی، اسی حالت میں اپنے وطن شاہو بگہہ ضلع گیا میں داعیِ اجل کو لبیک کہا،

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

اگست ۱۹۴۲ء کے معارف میں بیرونی کی کتاب الصیدلہ یا کتاب الصیدنہ کی اصل عربی یا فارسی ترجمہ کی بابت اہل علم سے استفسار کیا گیا تھا، مولوی سید حسن صاحب برنی مؤلف البیرونی نے اطلاع دی ہے کہ اس کا خلاصہ فارسی ترجمہ علی گڈہ مسلم یونیورسٹی کے کتب خانہ میں موجود ہے، اور اس کا ذکر ان کی کتاب البیرونی کے ص۲۶۹ پر ملے گا،

ان کی کتاب البیرونی کو نکال کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ کتاب نعات الطب میں ہے، نسخہ ۱۰۰۰ھ کا لکھا ہے، اس کا ترجمہ ہندوستان ہی میں عثمان الکاشانی نے کیا تھا، کتاب کا طرز یہ ہے کہ پہلے ہر دوا کا عام نام لکھا ہے، پھر عربی، یونانی، سریانی، جرجانی، خوارزمی، فارسی، عراقی، ہندی، سندھی نام لکھے ہیں، اور پھر اس کی خاصیت بیان کی ہے،

جنوبی ہند کی دو یونیورسٹیوں میں اردو، فارسی اور عربی کی دو کرسیوں کے قیام سے اس دور افتادہ حصۂ ملک میں اسلامی ادبیات کی ترقی کی نئی راہیں نکلی ہیں، میسور یونیورسٹی نے اپنے یہاں اردو اور فارسی کی ایک کرسی قائم کی ہے اور اس پر حیدرآباد کے نوجوان ادیب پروفیسر عبدالقادر سروری کا انتخاب کیا ہے جس کے لئے یونیورسٹی اور پروفیسر دونوں کی خدمت میں ہدیۂ تہنیت پیش ہے، تراونکور یونیورسٹی نے سری چترا ترنال مہاراجہ کی منظوری سے اپنے یہاں عربی کی کرسی بڑھائی ہے، اور اس کے لئے مسٹر محمد، ایم اے کو جو عربی کے لائق فاضل ہیں اور جن کے عربی میں خطوط میرے پاس وقتاً فوقتاً آیا کرتے ہیں، لکچرر مقرر کیا ہے، ان اطراف میں عربوں کی پرانی نوآبادی ہونے کے سبب سے عربی کی خاصی اہمیت ہے، اور اس بنا پر تراونکور یونیورسٹی کے اس ضروری اضافہ کی قدر سارے ملک میں کیجائیگی،



# مقالات

## امام رازی اور تنقید فلسفہ

از مولانا عبدالسلام صاحب ندوی

(۲)

ملاحدہ کا ایک اعتراض یہ ہے کہ اگر خدا موجود ہے اور اُس نے دنیا کو علم و حکمت کے ساتھ پیدا کیا ہے، تو اس میں برائیاں کیوں پائی جاتی ہیں، اگر وہ دنیا کو خیر محض کے ساتھ پیدا کرتا تو اس سے اس کی قدرت و حکمت زیادہ نمایاں ہوتی اس بنا پر شیخ نے اشارات میں خیر و شر پر ایک مفصل مضمون لکھا ہے، جس کا خلاصہ امام صاحب کی تشریح کے مطابق یہ ہے کہ خیر و شر کے لحاظ سے موجودات کی صرف پانچ قسمیں ہو سکتی ہیں،

(۱) وہ موجودات جن میں صرف بھلائی ہی بھلائی پائی جائے،

(۲) وہ موجودات جن میں اگرچہ کچھ برائیاں بھی ہوں لیکن ان میں بھلائی برائی سے زیادہ ہو،

(۳) وہ موجودات جن میں بُرائی اور بھلائی دونوں برابر برابر پائی جائیں،

(۴) وہ موجودات جن میں بُرائیاں بھلائی سے زیادہ پائی جائیں،

(۵) وہ موجودات جن میں صرف برائی ہی بُرائی پائی جائے،

ان میں پہلی قسم کا وجود تو خدا کی حکمت اور رحمت کے بالکل مطابق ہے، دوسری قسم بھی

حکمت سے خالی نہیں، کیونکہ اگر چند برائیوں کی وجہ سے ان کا وجود نہ ہو تو بے شمار بھلائیوں سے دست بردار ہونا پڑیگا، مثلاً آگ میں جلانے کی جو خاصیت ہے، اس سے ہزاروں فائدے حاصل ہوتے ہیں، لیکن کبھی کبھی اس سے بعض انسان یا جانور جل بھی جاتے ہیں، اس لئے اگر اس برائی کی وجہ سے اس کو پیدا نہ کیا جائے تو یہ تمام فوائد بھی حاصل نہ ہوں گے،

دنیا میں جتنی قسمیں ہیں وہ انہی دونوں قسموں میں داخل ہیں، ان کے علاوہ تیسری، چوتھی یا پانچویں قسم کا وجود نہیں ہے، کیونکہ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں اگرچہ آلام و اسقام نہایت کثرت سے پائے جاتے ہیں، لیکن صحت و سلامت کا وجود ان سے بہت زیادہ ہے، اس سے معلوم ہوا کہ یہ برائیاں بالکل عرضی ہیں، یعنی جن چیزوں میں بھلائیاں زیادہ ہیں ان کے لئے یہ تھوڑی سی برائیاں بھی لازم ہیں، اور اسی لزوم کی وجہ سے وہ برائیاں ان سے الگ نہیں ہو سکتیں، لیکن امام صاحب کے نزدیک حکماء کے اصول کے مطابق خیر و شر کی بحث ہی نہیں پیدا ہو سکتی، کیونکہ حکماء نہ خدا کو فاعل مختار مانتے ہیں اور نہ حسن و قبح عقلی کے قائل ہیں، اور یہ بحث انہی دونوں اصول سے تعلق رکھتی ہے، کیونکہ جو لوگ خدا کو فاعل مختار مانتے ہیں اور ان کے نزدیک خدا کو ہر کام کے کرنے یا نہ کرنے کا اختیار حاصل ہے، اُن سے یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ خدا نے ایسا کیوں کیا؟ اور ایسا کیوں نہیں کیا، لیکن جب حکماء کے نزدیک خدا موجب بالذات ہے، اور اس سے جو افعال صادر ہوتے ہیں، ان کا صادر نہ ہونا محال ہے، تو یہ سوال ہی نہیں کیا جا سکتا، آفتاب سے روشنی بہرحال نکلے گی، خواہ یہ روشنی مضر ہو یا مفید؟ کیونکہ روشنی آفتاب کے لئے لازمی ہے، اور اس سے روشنی کا نہ نکلنا محال ہے، اسی طرح اس سوال کے لئے حسن و قبح عقلی کا قائل ہونا بھی ضروری ہے، جیسا کہ معتزلہ کا عقیدہ ہے، ورنہ جو لوگ حسن و قبح عقلی کے قائل نہیں ان کے نزدیک خدا کے کسی فعل میں برائی نہیں ہے، وہ جو کچھ کرتا ہے وہ بہتر و پسندیدہ ہے، جیسا کہ اشاعرہ کا خیال ہے، بہرحال یہ بحث صرف معتزلہ



کے اصول کے مطابق صحیح ہو سکتی ہے، جو خدا کو فاعل مختار مانتے ہیں اور اس کے ساتھ حسن و قبح عقلی کے بھی قائل ہیں، لیکن جو لوگ ان دونوں اصولوں کو نہیں مانتے یعنی حکماء و اشاعرہ ان کے لئے ایک غیر ضروری بحث ہے، البتہ حکماء اس مسئلہ پر دو حیثیتوں سے بحث کر سکتے ہیں،

(۱) ایک تو یہ کہ ان کو یہ معلوم ہو جائے کہ مخلوقات الٰہی ان پانچوں قسموں میں سے کس قسم میں داخل ہیں، یعنی ان میں صرف بھلائی ہی بھلائی یا برائی ہی برائی پائی جاتی ہے، یا اُن میں برائی اور بھلائی دونوں مخلوط ہیں،

(۲) دوسرے یہ کہ خدا کو ایک کامل ترین نظام کا علم ہونا اس نظام کے وجود کی علت ہے، اس لئے یہ معلوم ہونا ضروری ہے کہ وہ کامل ترین نظام کیا ہے؟ تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ یہی نظام پیدا کیا گیا ہے،

بہرحال امام صاحب نے فلسفیانہ مسائل کی تردید میں اس کی کوئی تفریق نہیں کی ہے کہ وہ مذہب کے موافق ہیں یا مخالف؟ بلکہ وہ فلسفہ کے تمام مسائل پر اعتراضات کرتے ہیں، البتہ انھوں نے فلسفیانہ مسائل پر جو اعتراضات کئے ہیں، اُن کے پیش نظر رکھنے کے بعد انسان کو یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ فلسفہ کوئی تشفی بخش چیز نہیں ہے، اس لئے اُس کے دل سے فلسفہ کی عظمت کا اثر بالکل زائل ہو جاتا ہے، اور وہ ایک ایسے علم کی جستجو میں مصروف ہو جاتا ہے، جو نکتہ چینی اور خردہ گیری سے بالاتر ہو اور یہ چیز امام صاحب کے نزدیک قرآن مجید ہے، چنانچہ وہ خود اپنے وصیت نامہ میں لکھتے ہیں کہ "میں نے فلسفہ اور علم کلام دونوں کے طرز و روش کی جانچ کی تو ان میں وہ فائدہ نہیں دیکھا جو اس فائدہ کے برابر ہو جس کو میں نے قرآن مجید میں پایا کیونکہ وہ تمام عظمت و جلال کو صرف خدا کے لئے تسلیم کراتا ہے اور اعتراضات و مناقضات میں تعمق کرنے سے روکتا ہے"

فلسفیانہ مسائل پر رد و قدح کی ابتدا اگرچہ ابتدا ہی سے ہو چکی تھی، لیکن امام صاحب نے

اس کو انجام تک پہنچایا اسلئے جو لوگ فلسفہ کے حامی تھے، اُنھوں نے خاص طور پر امام صاحب کی نقض کی، اور ان کے اعتراضات کے جوابات دیئے، فلسفہ و حکمت کی دو قسمیں تھیں، ایک حکمت ذوقیہ جس کا موجد افلاطون تھا اور دوسری حکمت نظریہ جو ارسطو کی طرف منسوب تھی، مسلمانوں میں اگرچہ عام طور پر حکمت نظریہ یعنی ارسطو کے فلسفہ کی اشاعت ہوئی اور امام صاحب نے اسی فلسفہ کو اپنے اعتراضات کا آماجگاہ بنایا، تاہم شیخ الاشراق کی وجہ سے بعض مسلمان فلسفیوں میں حکمت ذوقیہ کا ذوق بھی پیدا ہو چکا تھا، اس لئے ان لوگوں کو فلسفہ کی یہ بے وقعتی گوارا نہیں ہوئی اور اُنھوں نے امام صاحب کے اعتراضات کو اسی ذوق کی ناآشنائی کا نتیجہ قرار دیا، اور امام صاحب کی اس فلسفیانہ روش کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا، چنانچہ شہرزوری نے جو غالباً حکمت ذوقیہ کا ذوق شناس اور شیخ الاشراق کا نہایت مداح ہے امام صاحب پر نہایت سخت الفاظ میں نکتہ چینی کی، وہ امام صاحب کے تذکرے میں لکھتا ہے، کہ وہ بحث و مناظرہ اور رد و قدح میں درجۂ کمال کو پہنچے ہوئے تھے، اور اُن کے زمانہ میں کوئی شخص بحث و نظر میں ان کا ہمسر نہ تھا، وہ نہایت ذہین، اور کثیر التفکر تھے، اکثر علوم میں ان کی تصنیفات ہیں، لیکن حکمائے محققین کے زمرے میں ان کا ذکر نہیں کیا جا سکتا، اور دقیق النظر لوگوں کی صف اول میں اُن کا شمار نہیں کیا جا سکتا، اُنھوں نے حکماء پر بہ کثرت شکوک و شبہات کئے، اور ان سے چھٹکارا نہ حاصل کر سکے، ان کے بعد جو لوگ پیدا ہوئے ان میں اکثر لوگ اُن کی وجہ سے گمراہ ہوئے اور ان شبہات سے چھٹکارا نہ حاصل کر سکے اور بعض لوگوں نے ان شبہات میں اور اضافہ کیا، ان شبہات کے حل نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں نے حکمائے قدیم کے مقاصد نہیں سمجھے، اُنھوں نے بحث کی بنیاد مشائیین کے قواعد پر رکھی جو حکمائے کشف و ذوق کے نزدیک خود نہایت بے بنیاد تھے ورنہ اگر انسان کو ذوق کے ذریعہ سے اصول صحیحہ کا علم ہو جائے تو اس کو ان کے حل کا طریقہ تھوڑی سی کوشش میں معلوم ہو جائے، اس قسم کے شبہات صرف اُن عامی اور زنگ آلو نفوس میں پیدا ہو سکتے



ہیں، جو فیض قدسی اور نزولِ نورِ الٰہی کے لئے تیار نہیں ہیں، یہی نور ہے، جس سے دل کھل جاتے ہیں اور اسی نور سے شبہات کا ازالہ ہوتا ہے اور حقائق و معارف حاصل ہوتے ہیں، ورنہ صرف ان کتابوں کے مطالعہ سے یقین علمی کا حاصل ہونا محال ہے، خدا اُس کے ملائکہ، اور اس کے ملکوت کے لطائف سے دوری کی علامت ان شبہات کا دلوں میں جڑ پکڑ جانا ہے، خلاصہ یہ کہ اُنھوں نے (امام رازی) حکمائے متالہین کا کوئی بھید نہیں پایا، اور علمائے قدیم کا مخفی علم حاصل نہیں کیا، بلکہ ان کا عمر بھر یہ کام رہا کہ لوگوں کے اقوال کو جمع کرتے تھے، اُن سے تفریعات کرتے تھے، اُن کی تحریر و تہذیب و توضیح کرتے تھے، کبھی ان میں اختصار پیدا کرتے تھے، کبھی ان کی تفصیل کرتے تھے، کبھی ایک ورق سے دوسرے ورق میں اور ایک مسودہ سے دوسرے مسودہ میں عبارت کے تغیر کے ساتھ ان کو منتقل کرتے رہتے تھے اور اس کا مقصد محض وہمی جاہ اور خیالی ریاست کا حاصل کرنا تھا، اور حکمت سے کوئی فائدہ نہیں اُٹھانا تھا، ان کی سب سے عجیب و غریب حالت یہ ہے کہ انھوں نے حکمت میں بہت سی کتابیں تصنیف کیں جس سے ان کو یہ وہم پیدا ہو گیا کہ وہ ان حکما میں سے ہیں جو انتہائی مرتبہ اور انتہائی مقاصد تک پہنچ گئے ہیں، حالانکہ وہ ان میں سے کمترین لوگوں کے مرتبہ کو بھی نہیں پہنچے، پھر وہ ابوالحسن اشعری متکلم کے مذہب کی طرف رجوع کرتے ہیں، جو یہ بھی نہیں جانتے کہ ان کے دونوں ہاتھوں میں سے کون سا ہاتھ زیادہ لمبا ہے، کیونکہ وہ حکمت بحثیہ اور حکمت ذوقیہ دونوں سے معرا تھے، اور حد کو مرتب کرنا اور دلیل کو قائم کرنا نہیں جانتے تھے، بلکہ وہ ایک غریب بڈھے ہیں، جو اپنے مذہب میں متحیر ہیں، اگرچہ وہ (امام رازی) حکمت کے حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے، تاہم ان میں حکمت کی بڑی استعداد موجود تھی، اور حکما کے کلام سے فوائد اور لطائف کے نکالنے کی ان کے نفس میں بہت زیادہ قوت تھی، لیکن اُن کا عیب یہ ہے کہ وہ تجرد و سلوک سے بالکل ناآشنا تھے، اس لئے وہ فراغتِ قلب نہ حاصل کر سکے، اور یہ چیز صرف اسی سے حاصل ہوتی ہے، اس لئے وہ حکما کے

مقامات تک ترقی نہ کر سکے اور اُن کے رموز و اسرار سے واقف نہ ہو سکے، ان کے بعض شبہات صحیح بھی ہیں، لیکن اخیر میں وہ اُن کی طرف اشارہ کرنے سے عاجز ہو گئے، کیونکہ ان کے پاس وہ اصل نہ تھی جس پر وہ اپنی بحث کی بنیاد رکھتے[1]

اس میں شبہہ نہیں کہ امام صاحب نے حکمت ذوقیہ کی تحصیل نہیں کی اور اس کے لئے مجاہدہ و ریاضت کی زحمت کبھی نہیں اُٹھائی، اس وقت مسلمانوں میں عام طور پر فلسفۂ مشائیہ کا رواج تھا، اور امام صاحب نے اسی فلسفہ کی تعلیم پائی تھی، اور اسی فلسفہ کے مسائل کو اُنھوں نے رد و قدح کے لئے سامنے رکھا تھا، اور اس فلسفہ کی نسبت خود شہرزوری کو تسلیم ہے کہ اس کی بنیاد مضبوط نہیں ہے، لیکن بدقسمتی سے مسلمانوں کا ایک بہت بڑا گروہ اسی فلسفہ کا گرویدہ تھا، اس لئے امام صاحب نے اسی بے بنیاد فلسفہ کی بنیاد کو اور بھی کھوکھلا کیا، اس لئے فلسفہ کی تردید سے اُن کا جو مقصد تھا حاصل ہو گیا،

امام صاحب کا دوسرا فلسفیانہ کارنامہ یہ ہے کہ فلسفہ کے متعلق جو اقوال اور دلائل فلسفہ کی کتابوں میں منتشر اور پراگندہ تھے، امام صاحب نے ان سب کو ایک جگہ جمع کیا، ان کی توضیح و تشریح کی اور ان سے نتائج نکالے، اس بنا پر اُنھوں نے فلسفہ کو نئے سرے سے مرتب کیا اور موجودہ شکل میں فلسفہ کی جو ترتیب پائی جاتی ہے وہ امام ہی صاحب کی ساختہ و پرداختہ ہے اور شہرزوری نے خود تسلیم کیا ہے کہ وہ عمر بھر اسی کام میں مصروف رہے،

شہرزوری امام صاحب کی ذہانت، اور فطانت کا بھی معترف ہے، اور ان کے بعض شبہات کو بھی صحیح سمجھتا ہے، اس بنا پر گو فلسفہ ذوقیہ کی ناآشنائی کی بنا پر وہ امام صاحب کو حکمائے محققین کے زمرہ میں نہیں شمار کرتا، تاہم جہاں تک حکمۃ بحثیہ یعنی فلسفۂ مشائیہ کا تعلق ہے شہرزوری کے نزدیک امام صاحب کے زمانہ میں بلکہ ان کے بعد بھی کوئی شخص ان کا ہمسر نہیں پیدا ہوا،

حکمت بحثیہ یعنی فلسفہ مشائیہ کے حامیوں نے بھی امام صاحب کی فلسفیانہ تصنیفات کی



تردید میں کتابیں لکھیں، اور اُن کے اعتراضات کے جواب دیئے، چنانچہ سب سے پہلے سیف الدین آمدی نے امام صاحب کی شرح اشارات کی تردید میں ایک کتاب لکھی[1]، اس کے بعد محقق طوسی نے بذات خود اشارات کی شرح لکھی، اور اس میں امام صاحب کے اعتراضات کے جوابات دیئے، پھر قطب الدین رازی نے محاکمات کے نام سے ایک کتاب لکھی، جس میں امام صاحب کے اعتراضات اور محقق طوسی کے جوابات کے درمیان محاکمہ کیا اور بدرالدین محمد بن اسعد یمانی نے بھی اس موضوع پر ایک کتاب لکھی، غرض امام صاحب کے زمانہ سے فلسفیانہ ہنگامہ آرائی کا ایک نیا دور شروع ہوا، اور فلسفیانہ مسائل کے ساتھ لوگوں کو جو عام دلچسپی پیدا ہوئی وہ اسی زمانہ سے ہوئی، اور فلسفیانہ مسائل کے بحث و تنقید کا کوئی پہلو تشنہ نہ رہ سکا، اس بنا پر فلسفہ کا جو ذوق آج تک موجود ہے وہ درحقیقت امام صاحب ہی کا پیدا کیا ہوا ہے، امام غزالی کے زمانہ تک فقہاء و محدثین فلسفہ منطق سے بالکل ناآشنا تھے، امام غزالی نے اس بیگانگی کو دور کیا، اور امام رازی نے اپنے زور تحریر اور دلائل کی قوت سے اس کو فقہاء و محدثین کا دلچسپ ترین مشغلہ بنا دیا، یہی وجہ ہے کہ امام صاحب کے زمانہ سے لوگوں نے قدماء کی کتابیں چھوڑ دیں اور امام صاحب کی تصنیفات کے مطالعہ میں مشغول ہو گئے،

امام صاحب نے فلسفہ پر جو اعتراضات کئے ہیں، محقق طوسی نے اُن کے جو جوابات دیئے ہیں اور قطب الدین رازی نے اُن کے درمیان جو محاکمہ کیا ہے، اس موقع پر مناسب تو یہ تھا کہ ان سب کو نقل کر کے ان کے درمیان موازنہ کیا جاتا، لیکن یہ اعتراضات و جوابات نہایت دقیق اور غیر دلچسپ ہیں، اور اُن کے موازنہ کے لئے نہایت دقیق اور طویل الذیل بحث کی ضرورت ہوگی، جس سے اس مضمون کے ناظرین کو کوئی دلچسپی نہ ہوگی، اس لئے ہم اُن کو نظر انداز کرتے ہیں، البتہ ایک آسان مسئلہ

---

[1] اخبار الحکماء قفطی ص۱۶۱،

کے متعلق امام صاحب اور محقق طوسی دونوں کی شرحوں کی عبارت کا خلاصہ درج کرتے ہیں، جس سے یہ اندازہ ہو سکے گا کہ امام صاحب فلسفیانہ مسائل کی تشریح کس جامعیت اور وضاحت کے ساتھ کرتے ہیں، شیخ نے قوت قدسیہ کے اثبات پر اشارات میں جو کچھ لکھا ہے اس کی شرح امام صاحب ان الفاظ میں کرتے ہیں :-

"شیخ جب فکر و حدس کے درمیان فرق بیان کر چکا، اور اس سے پہلے یہ بیان کر چکا تھا کہ انتقال حدسی نہایت دور رس اور عمدہ ہوتا ہے، اور جس روح میں یہ ہوتا ہے اسی کا نام قوت قدسیہ ہے تو اب اسی قوت قدسیہ کو ثابت کرنا چاہتا ہے، کیونکہ تقسیم عقلی کے رو سے جس چیز کا فرض کرنا صحیح ہو اس کا وجود ضروری نہیں ہے، (اس لئے اس پر دلیل قائم کرنے کی ضرورت ہے) اور اس پر جو دلیل لائی جاتی ہے وہ کبھی انّی ہوتی ہے، اور کبھی لمّی اور شیخ نے اس فصل میں دلیل انی کو بیان کیا ہے، اور کہا ہے کہ قوت قدسیہ حدس کی ایک قسم ہے، اس لئے حدس کا ثابت کرنا ضروری ہے، لیکن تجربہ سے ثابت ہوتا ہے کہ حدس کا علم بدیہی ہے، کیونکہ ہر وہ شخص جس میں تھوڑی سی ذہانت بھی پائی جاتی ہے، جب اپنی روح کا تجربہ کرتا ہے تو اس کو معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کو بعض اوقات ایسی چیزوں کا علم ہو جاتا ہے، جن کے حاصل کرنے کی وہ کوئی کوشش نہیں کرتا، لیکن حدس قوی یعنی قوت قدسیہ کے اسباب تو ہم کو یہ معلوم ہے کہ فکر کے لحاظ سے انسانوں کے مختلف درجے ہیں، بعض ایسے غبی انسان ہوتے ہیں جن کو فکر سے کسی نامعلوم چیز کا علم سرے سے حاصل ہی نہیں ہوتا، بعض میں تھوڑی سی ذہانت ہوتی ہے، بعض میں اس سے زیادہ قوت پائی جاتی ہے، اور وہ حدس کے قابل ہوتا ہے، اس لئے جس طرح نقصان کی انتہا ایسے شخص کی طرف ہوتی ہے، جس میں حدس سرے سے ہوتا ہی نہیں، اسی طرح زیادتی کی جانب ایسے شخص کی طرف انتہا ہونی چاہئے، جو اکثر حالات میں تعلم اور فکر سے بے نیاز ہو،



جاننا چاہئے کہ یہ دلیل دو طریقوں سے بیان کیجا سکتی ہے، ایک تو یہ کہ حدس میں کمی اور بیشی کے قبول کرنے کی صلاحیت ہے اسلئے اس طرح اس کمی کی انتہار ایسے شخص کی طرف ہو سکتی ہے جس میں حدس موجود ہی نہ ہو، اسی طرح زیادتی کی انتہار ایسے شخص کی طرف ہونی چاہئے جس میں غیر معمولی حدس پایا جائے، دوسرے یہ کہ حدس کو فکر کے ساتھ نسبت ہے اس لئے جس طرح یہ ضروری ہے کہ فکر کا جو طرف ناقص ہے، اُس کے مقابلہ میں ایک طرف کامل بھی ہونا چاہئے، اُسی طرح حدس میں بھی جس کا ایک پہلو ناقص ہے، اس کے مقابلے میں ایک پہلو کامل بھی ہونا چاہئے، لیکن یہ دلیل دونوں طریقوں سے کمزور ہے، کیونکہ یہ محض ایک تمثیل ہے،

قوت قدسیہ کے اثبات کا عمدہ طریقہ یہ ہے کہ تصدیقات نظریہ کی انتہار تصدیقات بدیہیہ پر ہوتی ہے، اور تصدیقات بدیہیہ اپنے اجزار کے تصورات پر موقوف ہیں، مثلاً اس بدیہی قضیہ کا علم کہ "کل جزو سے بڑا ہوتا ہے"، جزو، کل اور بڑے کے تصور پر موقوف ہے، اور اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ نفوس انسانی ان تصورات کے قابل ہیں پھر جب تصدیقات بدیہیہ کسی معلّم کی تعلیم پر موقوف نہیں ہیں، تو ان مفرد تصورات کو بھی بطریق اولیٰ کسی معلم کی تعلیم پر موقوف نہیں ہونا چاہئے، پھر تصدیقات بدیہیہ کی حقیقت جب یہ قرار پائی کہ اُن کے اجزار کا تصور ان کی تصدیق کے یقین کے لئے کافی ہو تو نفس انسانی بذات خود ان بدیہی قضایا کا علم حاصل کر سکتا ہے، اور اُن کا اجتماع ممکن ہے، اور اُن کی یہ حالت ہے کہ جب وہ مجتمع ہو جائیں گے، تو ان کے اجتماع سے لازمی طور پر علم نظری حاصل ہو جائیگا، تو جب تنہا نفس کا اُن تمام قضایا سے جن کے اجتماع سے لازمی طور پر علم نظری حاصل ہو جاتا ہے، متصف ہونا ممکن ہے تو اس علم نظری سے بھی کسی معلم کی تعلیم کے بغیر اس کا متصف ہونا ممکن ہوگا، پھر جب علوم نظریہ کو باہم ترکیب دیجائیگی، تو اسکو دوسرے نظری علوم لازم ہونگے، اس لئے ہمارے اس بیان کا اقتضار یہ ہے کہ تمام نفوس انسانی کو تمام علوم نظریہ بغیر کسی کوشش

کے فوراً حاصل ہو جائیں، اور حدس کے یہی معنی ہیں، لیکن نفس کا تدبیر بدن میں مشغول رہنا اس میں
رکاوٹ پیدا کرتا ہے، اور خیال بھی سدِ راہ ہوتا ہے، اس سے ثابت ہوا کہ حدس قوی فطرت صحیح
کا اقتضا ہے، اور فکر کی ضرورت محض عوارض کی وجہ سے ہوتی ہے، اسی لئے رسول اللہ صلعم نے فرمایا
کہ ہر بچہ اسلام کی فطرت پر پیدا ہوتا ہے"۔

شیخ کی اسی عبارت کی شرح محقق طوسی نے ان الفاظ میں کی ہے:

"شیخ قوت قدسیہ کے وجود کو ثابت کرنا چاہتا ہے، اور اس کے اثبات کا طریقہ یہ ہے کہ
مطلوب تک پہنچانے میں کیف و کم کے لحاظ سے حدس اور فکر کے مختلف درجے ہیں، کیف کے لحاظ
سے تو اس لئے کہ مطلوب تک یہ کبھی تیزی سے پہنچاتے ہیں اور کبھی دیری سے اور کم کے لحاظ سے اسلئے
کہ کبھی مطلوب کی تعداد زیادہ ہوتی ہے، اور کبھی کم، کیف کا یہ اختلاف فکر میں زیادہ ہوتا ہے، کیونکہ
اس میں حرکت پائی جاتی ہے اور کم کا اختلاف حدس میں زیادہ ہوتا ہے، کیونکہ اس میں حرکت نہیں
پائی جاتی اور حدث نفس کی قوت سے پیدا ہوتا ہے، ان مختلف درجوں میں نقصان و کمال
کی دو حدیں ہیں، نقصان کی حد تو یہ ہے کہ ایک شخص کی تمام فکریں مطالب کے حاصل کرنے سے قاصر ہیں
اور کمال کی حد یہ ہے کہ ایک ہی شخص کو وہ تمام علوم دفعۃً حاصل ہو جائیں جو اسکی نوع کو مقدار کے
لحاظ سے حاصل ہو سکتے ہیں، یا اسی کے قریب کیف کے لحاظ سے ایسے طریقہ پر کہ حدود وسطی پر مشتمل ہو، تقلیدی
نہ ہو، اور چونکہ نقصان کا پہلو عام طور پر نظر آتا ہے، اسلئے کمال کا پہلو بھی ممکن الوجود ہوگا"۔

ان دونوں عبارتوں کے موازنہ کرنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ امام صاحب پہلے تو خود دلیل کی
تحلیل نہایت وضاحت کے ساتھ کرتے ہیں، پھر اسکی کمزوریوں کو دکھاتے ہیں، اسکے بعد اگر ممکن ہوتا ہے
تو خود اس مسئلہ پر مستقل دلیل قائم کرتے ہیں، لیکن محقق طوسی کی عبارت ان باتوں سے بالکل خالی ہے"

---



# حضرت میرزا مظہر جانجاناںؒ

از

جناب عبد الرزاق صاحب قریشی

جانِ جان نام، مظہر تخلص، شمس الدین حبیب اللہ لقب، علوی نسب، نقشبندی مشرب،
مرزا صاحب کا سلسلۂ نسب ۲۸ واسطوں سے محمد بن حنفیہ کے توسط سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ
تک پہنچتا ہے، مصحفی کا بیان ہے کہ

"والہ داغستانی در ریاض الشعراء مرزا مزبور را از سادات علویہ نوشتہ و این غلط محض
است چراکہ مرزا بقول صحیح از اتراک توران است[1]"۔

نہیں معلوم مصحفی کو یہ غلط فہمی کیوں پیدا ہوئی، تمام تذکرہ نگار اس بات پر متفق ہیں، اور خود
مرزا صاحب کا اپنا بیان ہے کہ ان کا سلسلۂ نسب حضرت محمد بن حنفیہ کے توسط سے حضرت علی
کرم اللہ وجہہ سے ملتا ہے[2]، محض اس بنا پر کہ ان کے جد بزرگوار نے ترکستان میں سکونت اختیار
کر لی تھی، ان کا سلسلۂ نسب تو نہیں بدل سکتا،

مرزا صاحب کے اجداد میں ایک بزرگ امیر کمال الدین (جن کا سلسلۂ نسب ۱۹ واسطوں سے
محمد بن حنفیہ کے توسط سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے ملتا ہے) آٹھویں صدی ہجری میں طائف سے
ترکستان گئے، اور وہاں کے حاکم سردار الوس قاقشالاں کی لڑکی سے اُن کی شادی ہو گئی، چونکہ

---

[1] عقد ثریا [2] کلمات طیبات و سرو آزاد ص ۲۳۱۔

اس حاکم کے کوئی اولاد نرینہ نہ تھی، اس کی حکومت امیر کمال الدین کو مل گئی، جب ہمایوں نے دوبارہ ایران کی مدد سے اپنی کھوئی ہوئی سلطنت دوبارہ حاصل کی تو اس خاندان کے دو بھائی مجنوں بیگ اور بابا خاں بھی اس کے ساتھ ہندوستان آئے، حضرت میرزا مظہر جانجاناں، بابا خاں کی اولاد میں ہیں[1] مختصر شجرۂ نسب یہ ہے:-

میرزا جانِ جاں بن مرزا جان بن مرزا عبد السبحان بن مرزا محمد امان بن شاہ بابا سلطان ابن بابا خاں بن امیر غلام محمد بن امیر محمد بن خواجہ رستم شاہ بن امیر کمال الدین،

بابا خاں[2] نے اکبر کے زمانہ میں بغاوت کی جس کی پاداش میں اس خاندان کے لئے مناصب کے دروازے بند کر دیئے گئے، خود مرزا صاحب کا بیان ہے کہ

"پدرم بجرم خان مذکور (بابا خاں) کہ در عہد اکبری مصدر بغی شدہ بود بعارکم منصبی گرفتار بود"[3]

لیکن خوشگو کا یہ بیان صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ

"این خاندان را در سرکار پادشاہی نوکر نمیگر فتند مگر میرزا جان والد شریفش کہ منصبدار عالمگیر بادشاہ بود"

یہ بالکل قرین قیاس ہے کہ بغاوت کی پاداش میں پنجہزاری، ہفت ہزاری وغیرہ کے عہدے اس خاندان کے لئے بند کر دیئے گئے ہوں لیکن یہ کہنا کہ سرکار شاہی میں کوئی عہدہ ہی نہ ملتا تھا حالات کو جانتے ہوئے، بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے، خود مرزا صاحب کا بیان ہے کہ

"خدمت در فاقت سلاطین گورگانیہ شعار مردم این خاندان بود"[4]

---

[1] کلمات طیبات سفینہ خوش گو میں ہے:- کہ "از تبار مجنوں خان قاقشال است" لیکن کوئی وجہ نہیں کہ ہم خوش گو کے بیان کو مرزا صاحب کے بیان پر ترجیح دیں) [2] ان کے حالات کے لئے دیکھئے اکبر نامہ [illegible]
[3] کلمات طیبات [4] سرو آزاد ص ۲۳۱،



مرزا صاحب کے بڑے دادا مرزا محمد امان (بابا خاں کے پوتے) کی شادی اکبر بادشاہ کی پوتی سے ہوئی تھی،[1] اس طرح ان کے دادا مرزا عبد السبحان تیموری خاندان کے نواسہ ہوتے ہیں،

مرزا عبد السبحان منصب شاہی پر فائز تھے،[2] وہ مرتبۂ عالی پر فائز ہونے کے باوجود بہت خدا ترس و خدا پرست تھے، طریقۂ چشتیہ میں لوگوں کو مرید کرتے تھے، اُن کی ماتحتی میں جتنے سپاہی سوار اور خدمتگار تھے، سب تہجد گذار تھے[3]،

مرزا صاحب کی دادی، وزیر المماک آصف الدولہ نواب اسد خاں[4] عالمگیر شاہی کی بیٹی تھیں[5]، وہ شیعہ تھیں، لیکن شوہر کے فیضِ صحبت سے سنی ہو گئی تھیں، وہ اس قدر عبادت گذار تھیں، اور اُن کی صفائی باطن اتنی بڑھ گئی تھی کہ تسبیحِ جمادات سُن سکتی تھیں، وہ عورتوں کو مثنوی مولانا روم کا درس بھی دیتی تھیں[6]،

مرزا صاحب کی والدہ بیجاپور کے شاہی خاندان سے تھیں، وہ بہت پارسا، نیک و عبادت گذار تھیں، اور جود و سخا میں تو اپنی نظیر نہیں رکھتی تھیں[7]،

**مرزا جان** حضرت مرزا کے والد بزرگوار کا نام مرزا محمد جان تھا، وہ اکثر علوم میں ماہر تھے، شعر و شاعری سے بھی لگاؤ تھا، جانی تخلص کرتے تھے، حضرت شاہ عبد الرحمن قادری کے مرید تھے[8]،

---

[1][2][3] معمولات مظہریہ ص ۱۴۲ [4] محمد ابراہیم نام، پسر ذو الفقار خاں قرامانوست، نواسۂ صادق خاں میر بخشی و خویش یمین الدولہ آصف خاں، "اسد خاں خطاب شاہجہانی دربار سے ملا تھا، ترقی کرتے کرتے عہد اورنگ زیب میں منصب وزارت پر فائز ہوئے، (مفصل حالات کے لئے دیکھئے مآثر الامرا، جلد اول) [5] مخزن الغرائب (نسخہ دار المصنفین) مقامات مظہری خزینۃ الاصفیا (معمولات مظہریہ میں خالہ زاد بہن لکھا ہے، صاحبان آب حیات و گل رعنا کا بھی یہی بیان ہے، گمان غالب ہے کہ ان دونوں حضرات کے سامنے معمولات ہی کا نسخہ تھا، مقامات مظہری، جس کے مصنف، صاحب معمولات کی طرح مرزا صاحب کے مریدوں میں ہیں، معمولات کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئی ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ صاحب مقامات نے معمولات کے اس بیان کو صحیح تسلیم نہیں کیا) [6][7] معمولات مظہریہ ص ۱۴۲،
[8] شاہ صاحب کا مزار شاہجہان آباد میں لاہوری دروازہ اور کابلی دروازہ کے درمیان واقع ہے، اس محلہ کو مسجد پری کہتے تھے، (مقامات مظہری، فٹ نوٹ ص ۱۶)

مرزا جان ابتداءً سرکاری ملازموں میں تھے، لیکن دنیاوی بادشاہ کا دربار انھیں کچھ پسند نہ آیا، بادشاہ بادشاہان کے دربار میں عالی منصب حاصل کرنے کا خیال پیدا ہوا، اس لئے اپنے عہدہ سے مستعفی ہوگئے، صاحب گلشن بیخار کا بیان ہے کہ مرزا صاحب کسی سبب سے اورنگ زیب سے ناراض ہو کر اپنے عہدہ سے مستعفی ہوگئے تھے، لیکن اس بیان کی تصدیق اور کسی ذریعہ سے نہیں ہوتی بہرحال یہ یقینی ہے کہ مرزا جان نے اپنے عہدہ سے مستعفی ہو کر فقیری اختیار کرلی اور اپنا سارا مال و دولت راہِ خدا میں فقرا و مساکین میں تقسیم کر دیا، پچیس ہزار روپیے لڑکی کے نکاح کے لئے رکھ چھوڑے تھے، ایک دن سنا کہ ایک دوست مالی مشکلات میں آن پڑے ہیں، پوری رقم ان کے حوالہ کر دی[1]،

مرزا صاحب میں توکل بہت تھا، ایک بار گھر میں کدو کا بیج بویا تھا لونڈی نے کہا آپ نے توکل کا دعویٰ رکھتے ہوئے بھی گھر میں کدو کی بیل لگائی ہے، ممکن ہے فاقہ کی حالت میں یہ خیال گذرے کہ اس کے پھل اور پتوں سے پیٹ بھرلوں، مرزا صاحب نے فوراً بیل کو اکھڑوا دیا[2]،

مرزا جان نے سنہ ۱۱۳۰ھ میں انتقال کیا،

**میرزا جانجاناں وجہ تسمیہ**

مولانا محمد حسین آزاد، آبِ حیات میں لکھتے ہیں، کہ

"آئینِ سلطنت تھا کہ امراء کے ہاں اولاد ہو تو حضور میں عرض کریں بادشاہ خود نام رکھیں یا پیش کئے ہوئے ناموں میں سے پسند کر دیں، کسی کو خود بھی بیٹا بیٹی کر لیتے تھے، یہ امور طرفین کے دلوں میں اتحاد اور محبت پیدا کرتے تھے، ان کیلئے ایک وقت پر سند ترقی ہوتے تھے، اور بادشاہوں کو اُن سے وفاداری اور جان نثاری کی اُمیدیں ہوتی تھیں"

[1] [2] مقامات مظہری ص۱۴،



چونکہ حضرت میرزا کے والد بزرگوار بھی امرا میں سے تھے، گو حضرت کی پیدائش کے وقت وہ مستعفی ہو چکے تھے، اس لئے جب حضرت مرزا پیدا ہوئے تو اورنگ زیب کو خبر بھیجی گئی، اس نے کہا چونکہ بیٹا، باپ کی جان ہوتا ہے، اور اس بچہ کے باپ کا نام مرزا جان ہے، اس لئے اس کا نام ہم نے جانِ جاں رکھا، لوگوں نے بڑھا کر جانِ جاں کو جانجاناں بنا دیا، اور یہ تغیر خود مرزا صاحب کی زندگی ہی میں ہو گیا تھا، چنانچہ خود مرزا صاحب نے اپنے مکاتیب میں ہمیشہ جانجاناں لکھا ہے، صاحب مجمع النفائس مرزا صاحب کے ہمعصر تھے، ان کا بھی بیان ہے کہ

"حالا بجان جاناں شہرت گرفتہ"

آزاد بلگرامی بھی مرزا صاحب کے ہمعصر تھے، وہ ان کے نام اور تخلص کے سلسلہ میں ایک دلچسپ نکتہ پیدا کرتے ہیں، لکھتے ہیں کہ

"نام و تخلص او گویا عنایت ترجمان اسرار قیومی مولانائے رومی است کہ پانصد سال پیش ازیں در دفتر ششم مثنوی ارشاد فرمودہ و کرامتی بحضار انجمن استقبال وانمودہ یعنی

جان اوّل مظہر درگاہ شد — جانِ جاں خود مظہرِ اللہ شد"

اس کے بعد آزاد لکھتے ہیں کہ

"لیکن نام او بر السنہ میرزا جانجاناں جاری شدہ[1]"

میر تقی میر کا بیان ہے کہ ان کے والد کا نام مرزا جان تھا بیٹے کو فرطِ محبت سے جانِ جاں کہا کرتے تھے، اور بالآخر وہ اسی نام سے مشہور ہوئے[2] لیکن یہ صحیح نہیں، مرزا صاحب کے نام کی اصل وجہ تسمیہ وہی ہے جو ہم نے اوپر بیان کی، ہم اپنے دعوے کے ثبوت میں مصحفی کا یہ بیان پیش کر سکتے ہیں

"روزی وجہ تسمیہ خود در پیش فقیر بیان کردہ اعنی اسم والد من مرزا جان بود چوں"

[1] سرو آزاد [2] نکات الشعراء [3] عقد ثریا،

"واخر عمر خلد مکان قدم بعالم وجود گذاشتم واین خبر بسمع بندگان اقدس رسید ارشاد شد کہ

نام این پسر جان جان باید گذاشت"۱؎

مولانا محمد حسین آزاد، مرزا صاحب کے نام کے سلسلہ میں لکھتے ہیں کہ ان کے والد نے اپنے طور پر ان کا نام شمس الدین رکھا، لیکن وہ عالمگیری نام کے سامنے نہ چمک سکا، مولانا عبد الحئی (صاحب گل رعنا) نے بھی "شمس الدین جانجاناں" نام لکھا ہے، لیکن اس کی تصدیق کسی ذریعہ سے نہیں ہوتی، بلکہ معمولات مظہریہ میں جو مرزا صاحب کے ایک مرید کی لکھی ہوئی کتاب ہے شمس الدین حبیب اللہ لقب بتایا گیا ہے،

**سال ولادت** حضرت میرزا کے والد بزرگوار جب اپنے عہدہ سے مستعفی ہو کر دکن سے آگرہ آرہے تھے تو حضرت میرزا کالا باغ میں جو حدود مالوہ میں واقع ہے" ۱۱ رمضان المبارک، شب جمعہ وقت فجر پیدا ہوئے، مرزا صاحب کا سال ولادت عام طور پر تذکروں میں ۱۱۱۱ھ ملتا ہے، معمولات مظہریہ اور مقامات مظہری، دو کتابیں خاص مرزا صاحب کے حالات میں لکھی گئی ہیں، صاحب معمولات نے ۱۱۱۱ھ اور صاحب مقامات نے ۱۱۱۱ھ یا ۱۱۱۳ھ سال ولادت لکھا ہے، صاحب مقامات نے تاریخ پیدائش کے دو مادے بھی دیئے ہیں (۱) تولد صاحب شرع (۲) طلوع شمس الملت والدین، ان دونوں مادوں سے ۱۱۱۱ھ نکلتا ہے، لیکن یہ تاریخ کسی قدر مشکوک ہے، اور خود مرزا صاحب کے اپنے مختلف بیانات نے ان کے سال ولادت کے متعلق اختلاف پیدا کر دیا ہے، مرزا صاحب نے اپنے سال پیدائش کا ذکر تین مختلف موقعوں پر کیا ہے،

(۱) مولوی غلام علی آزاد بلگرامی کی استدعا پر جب اپنے حالات (سرو آزاد) کے لئے لکھ کر بھیجے ہیں تو اس میں لکھا ہے کہ

"......در عشرہ اولی مائہ ثانیہ بعد الف ولادتش (ولادت مرزا صاحب) اتفاق افتاد"۲؎

۱؎ مقدمہ ثریا ۲؎ سرو آزاد ص ۲۳۱،



اس بیان کے مطابق ان کا سنہ ولادت ۱۱۱۱ھ سے پہلے ہونا چاہئے،

(۲) اپنے فارسی دیوان کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ

"امروز ہزار وصد و ہفتاد ہجری است وعمر بشصت رسیدہ"

اگر اس بیان کو صحیح مان لیا جائے تو ان کا سال ولادت ۱۱۱۰ھ اور ۱۱۱۱ھ کے مابین قرار پاتا ہے،

(۳) اپنے ایک مرید کے اصرار پر اپنے مختصر حالات اسکو لکھ کر بھیجتے ہیں، اس میں اپنا سال پیدائش ۱۱۱۳ھ لکھتے ہیں، خود مرزا صاحب کے الفاظ یہ ہیں:-

"در ہزار وصد و سیزدہ ولادت فقیر اتفاق افتاد"۱؎

اسی مکتوب میں اپنے والد ماجد کے سال وفات کے متعلق فرماتے ہیں کہ

"در سال ہزار وصد و سی ہجری انتقال ازایں عالم فرمودہ...... در عمر شانزدہ سالگی گرد یتیمی بر رو نشست"۲؎

مرزا صاحب کے والد کا انتقال ۱۱۳۰ھ میں ہوتا ہے اور مرزا صاحب کی عمر اس وقت سولہ سال کی ہے، تمام تذکرے مرزا صاحب کی اس عمر کے بارے میں متفق اللفظ ہیں، لہذا اگر اس بیان کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو مرزا صاحب کا سال پیدائش ۱۱۱۳ھ زیادہ قرین صحت معلوم ہوتا ہے،

بہر نوع اس قدر یقینی ہے کہ مرزا صاحب کا سال پیدائش ۱۱۰۹ھ اور ۱۱۱۳ھ کے مابین ہے، صاحب معمولات مظہریہ مولوی نعیم اللہ بہرائچی نے اس اختلاف کی طرف اشارہ کیا ہے اور نہایت وثوق کے ساتھ لکھا ہے کہ مرزا صاحب کا سال ولادت ۱۱۱۱ھ ہے نہ کہ ۱۱۱۳ھ،

۱؎ ۲؎ کلمات طیبات،

لیکن افسوس کہ اُنھوں نے اپنے دعوے کے ثبوت میں کوئی دلیل پیش نہیں کی، محض ان کا مرزا صاحب کا مرید ہونا توان کے دعوے کی سچائی کا ثبوت نہیں ہو سکتا،

**وطن** جیسا کہ ہم اوپر عرض کر چکے ہیں، مرزا صاحب کے آبا و اجداد در اصل طائف کے رہنے والے تھے، وہاں سے ان کے جد بزرگوار امیر کمال الدین، ترکستان چلے گئے اور تین چار پشتیں وہیں گذر گئیں، پھر امیر بابا خاں اور مجنوں خاں ہمایوں کے ساتھ ہندوستان آئے، پہلے تو یقیناً اُنھوں نے دہلی کو اپنا مسکن بنایا ہوگا، لیکن جب اکبر نے آگرہ کو اپنا دار الخلافہ بنایا تو قیاس کہتا ہے کہ مرزا محمد امان (داماد اکبر بادشاہ) بھی آگرہ اُٹھ آئے ہوں گے، بہرحال یہ یقینی ہے کہ مرزا صاحب کے والد مرزا جان کا مسکن شہر آگرہ تھا، چنانچہ مرزا صاحب کی نشو و نما اور ابتدائی تعلیم و تربیت اکبر آباد ہی میں ہوئی، لیکن خود مرزا صاحب نے دہلی کو اپنا مسکن بنایا[1] اور یہیں ان کی تربیت باطنی ہوئی، دہلی میں مرزا صاحب کی خانقاہ جامع مسجد کے قرب و جوار امام میں تھی[2]

**تعلیم و تربیت** مولانا محمد حسین آزاد، آب حیات میں مرزا صاحب کی تعلیم کے بارے میں فرماتے ہیں کہ

"مرزا صاحب کی تعلیم عالمانہ نہ تھی، مگر علم حدیث با اصول پڑھا تھا"

لیکن حقیقت یہ ہے کہ مرزا صاحب کی تعلیم ہر حیثیت سے نہایت اچھے پیمانہ پر ہوئی تھی، صاحب خزینۃ الاصفیا کا بیان ہے کہ

"از ہر فن و علم ظاہری بہرۂ کامل حاصل نمود"

مرزا صاحب بہت چھوٹے تھے کہ اسی وقت سے ان کے والد نے ان کی تعلیم کا اہتمام

۱؎ گلشن بیخار ص ۲۲۰ ۲؎ عمدہ منتخبہ بحوالہ اودھ کیٹلاگ،



کیا اور ہمیشہ ان کو تاکید فرماتے کہ وقت اور عمر کا کوئی نعم البدل نہیں، اس کو ضائع نہ کرنا چاہئے[1]

اس سلسلہ میں مرزا صاحب کے ایک ہمعصر تذکرہ نویس کا بیان بھی سننے کے قابل ہے، احمد علی سندیلوی اپنے تذکرہ مخزن الغرائب میں لکھتے ہیں کہ

"در صغر سن صرف و نحو، پارہ از معقول و حدیث و تفسیر و عروض و قافیہ تلخیص المفتاح خواندہ متوجہ بشعر گوئی شدند"

ایک دوسرے ہمعصر تذکرہ نویس فتح علی گردیزی (صاحب تذکرۂ ریختہ گویاں) کا بیان ہے کہ

"از آنجا کہ علم فقہ و حدیث حظی وافر دارد و از کتب سیر و تواریخ بہرہ متکاثر....."

مرزا صاحب نے فارسی کی تکمیل اپنے والد ماجد سے کی، کلام اللہ قاری حافظ عبد الرسول دہلوی تلمیذ شیخ القراء شیخ عبد الخالق سے پڑھا اور علم تجوید و قرأت کی سند بھی انھی سے لی، والد کی وفات کے بعد علم حدیث و تفسیر اور دوسری کتب مبسوطہ حضرت حاجی محمد افضل سیالکوٹی تلمیذ شیخ المحدثین شیخ عبد اللہ بن سالم مکی سے پڑھیں[2]

مرزا صاحب کے والد ماجد ان کو اکثر یہ نصیحت فرمایا کرتے تھے کہ

"از برائے فہم معانی قرآن مجید و تدبر در احادیث مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم، از محاورات عرب وقوف و اطلاع ضرور است ہمچنیں برائے فہم معانی مقصودہ از محاورات مردم ایں دیار، وقت ہمکلامی نیز از وقوف تمام چارہ نیست تا در حضور عقلا از عدم فہم معانی مقصودہ انفعال کشیدہ نشود"[3]

درسی اور متداول علوم کے علاوہ آداب بادشاہی، فن سپہ گری اور دوسرے متداول فنون کی بھی مرزا صاحب کو تعلیم دی گئی تھی اور اُنھوں نے ہر ہنر میں وہ کمال پیدا کیا تھا کہ تو

۱؎ مقامات ص ۱۵ ۲؎ کلمات طیبات ۳؎ معمولات ص ۱۴،

ان سے اپنے اپنے ہنر کی داد مانگتے اور ان کو اپنا اُستاد تسلیم کرتے،[1]

استعمالِ اسلحہ میں وہ کمال پیدا کیا تھا کہ فرماتے تھے کہ اگر بیس آدمی تلوار سے مجھ پر حملہ کریں اور میرے ہاتھ میں صرف ایک لکڑی ہو تو انشاء اللہ کوئی مجھے زخمی نہیں کر سکتا،[2]

ایک مرتبہ مغرب کی نماز پڑھ رہے تھے، جب سلام پھیرا تو ابر کی تاریکی میں کسی شخص نے ان پر خنجر کا وار کیا، اتفاق سے بجلی چمکی اور اُنھوں نے اس کی چمک میں خنجر کو دیکھ لیا، اور اس کے ہاتھ سے چھین کر پھر اس کو دیدیا، اُس نے پھر حملہ کیا، اُنھوں نے پھر چھین لیا، اور اس کو دیدیا، اس نے سات بار حملہ کیا اور ساتویں بار مرزا صاحب نے خنجر اس کے ہاتھ سے چھین لیا، آخر وہ قدموں پر گر پڑا، اور معافی کا خواستگار ہوا،[3]

ایک بار گھوڑے پر سوار کہیں جا رہے تھے کہ راستہ میں سامنے سے ایک مست ہاتھی آ رہا تھا، ہاتھی نے قریب پہنچکر ان کو سونڈ میں لپیٹ لیا، اُنھوں نے میان سے خنجر نکالا، اور ہاتھی کے سونڈ پر اس زور سے مارا کہ اُس نے بیتاب ہو کر ان کو چھوڑ دیا اور وہ سلامت بچ گئے،[4]

مرزا صاحب کپڑا کاٹنا خوب جانتے تھے، چنانچہ صاحبِ مقامات کا بیان ہے۔

"تقطیعِ سراویل ایشان را بہ پنجاہ طرز می آید"

زینت باطنی

مرزا صاحب کے والد مرزا جان نے ۱۱۳۰ھ میں وفات پائی، اُس وقت مرزا صاحب کی عمر سولہ سال تھی، مصحفی عقد ثریا میں لکھتے ہیں[5] کہ

"بعد فوتِ والد ماجد خود مال و اسباب فراوان کہ بدستش افتادہ بود بذلِ مجالس و دعوتِ یاران نمود و در ہیژدہ سالگی ہمہ را پاک فروختہ کلاہِ درویشی بر سر گذاشت۔"

مرزا صاحب نے والد کی وفات کے بعد دو سال دنیا طلبی میں گذارے، اور اس بات کی

[1-2] معمولات ص۱۵ [3] مقامات مظہری ص ۱۵ [4] ایضاً ص۱۶



کوشش کی کہ دربار میں کوئی منصب مل جائے، اُن کے والد کو انتقال کئے ہوئے کوئی دو برس ہو چکے تھے، کہ ایک دن کچھ لوگ سفارش کی غرض سے ان کو بادشاہ (فرخ سیر) کی خدمت میں لے گئے، اتفاق سے بادشاہ کو زکام ہو گیا تھا، اور وہ اس دن دربار میں نہ آ سکا، اس لئے مرزا صاحب کو مایوس و ناکامیاب لوٹنا پڑا، اُسی رات خواب میں دیکھا کہ ایک بزرگ کے مزار پر گئے ہیں، صاحب مزار قبر سے باہر آئے، اور اپنی ٹوپی (طاقی) ان کے سر پر رکھی، اس خواب کے بعد مرزا صاحب نے دنیا طلبی کا خیال چھوڑ دیا،[1]

ایک دن اپنے گھر پر بیٹھے تھے، اسبابِ طرب بھی تھا اور مجمعِ احباب بھی، اتفاقاً کسی نے حضرت سید نور محمد بدایونی[2] کا ذکر کر دیا، اور ان کے اوصافِ حمیدہ بیان کئے "نہ جانے مرزا صاحب کے دل میں کیا سمائی کہ تمام دوستوں کو چھوڑ کر اسی وقت آستان بوسی کے لئے روانہ ہو گئے، حضرت سید نے استخارہ مسنونہ کے بعد ان کی صلاحیت و استعداد کے مطابق ان کو ذکر طریقۂ عالیہ بتایا، ان سے کہا کہ آنکھیں بند کرو اور خود توجہ دینی شروع کی، چنانچہ ایک ہی توجہ میں "لطائف خمسہ ذاکر کردہ رخصت نمودند"۔[3]

یہ بتا دینا ضروری ہے کہ مرزا صاحب کا حضرت سید نور محمد بدایونی کی خدمت میں حاضر

[1] معمولات مظہریہ ص۱۵ [2] حضرت سید نور محمد بدایونی نے کسبِ سلوک حضرت شیخ سیف الدین فرزند و خلیفہ عروۃ الوثقیٰ حضرت محمد معصوم فرزند سجادہ نشین حضرت مجدد سے کیا تھا، علوم ظاہر و باطن دونوں میں کمال حاصل تھا، ان کا استغراق اور قوت جذبی بہت بڑھی ہوئی تھی، سنت نبوی کا اتباع بہت سختی سے کرتے تھے، کثرت مراقبہ کی وجہ سے پیٹھ خم ہو گئی تھی، اہل دنیا کی صحبت سے سخت اجتناب تھا، مرزا صاحب کو ان سے غایت درجہ محبت تھی، ان کا نام زبان پر آتے ہی آنکھیں پرنم ہو جاتیں (مقامات مظہری) ۱۱ ذیقعدہ ۱۱۳۵ھ کو انتقال فرمایا، مزار شریف بیرون کوٹلہ سلطان المشائخ، جانب پائین واقع ہے [3] معمولات مظہریہ ص۱۶،

ہونا محض ایک اتفاقی بات نہ تھی، بلکہ عشق ایزدی ان کے خمیر میں موجود تھا، اور بچپن ہی سے ان کے والد نے ہمیشہ ان کے کانوں میں اسی قسم کی باتیں ڈالی تھیں، صاحبِ معمولات مظہریہ کے الفاظ میں مرزا جان مرزا صاحب کو ہمیشہ یہ نصیحت فرمایا کرتے تھے کہ

"ہر کہ دلش بداغ عشق برشتہ نمی شود خاشاکِ طبیعت او سوختہ و پاک نمی گردد، زمین طینتِ او صلاحیتِ تخمِ محبتِ الٰہی ندارد، زیرا کہ عشق مجازی زینۂ عشق حقیقیست پس ما وا مکہ رشتۂ عشق مجازی طوق گلو کردہ، در کوچہ و بازار رسوا و خوار نسازید، روح فقیر از شما راضی نخواہد شد اما غیر از وسیلہ امری دریں راہ منظور نباشد، چوں بوسیلۂ ایں دولت راہی مطلب کشادہ گردد جانبازی در راہ مولیٰ کہ پادشاہِ پادشاہانِ معشوقانِ اعلیٰ و ادنی است اختیار باید نمود کہ سعادت جاودانی مربوط باآنست"

"آشنائی در حقیقت کیش و آئینِ مردانست ......... جز واعظم دریں باب جوش و گرمیست"

بہر حال ۱۸ سال کی عمر میں مرزا صاحب حضرت سید نور محمد بدایونی کے حلقۂ مریدین میں داخل ہوئے اور طریقۂ نقشبندیہ پر عمل کرنے لگے، چار سال تک اُن کی خدمت میں رہنے کے بعد ولایت کبریٰ و خرقہ و اجازتِ مطلقہ حاصل کی،[1]

حضرت سید نور محمد بدایونی نے سنہ ۱۱۳۵ھ میں انتقال فرمایا، لیکن مرزا صاحب نے اب بھی اس آستانہ کو نہ چھوڑا، چھ سال تک ان کے مزار کی مجاوری کی اور بطریق اویسیت کسبِ ولایت علیا کیا، شیخ علی کیفری شیخ العرب رحمۃ اللہ علیہ نے جو حضرت شیخ محمد صدیق سرہندی نبیرۂ حضرت مجدد الف ثانی کے خلفائے اجل میں سے تھے اس بشارت کی شہادت دی تھی،[2]

[1] معمولات مظہریہ ص ۱۔ [2] ایضاً ص ۱۵،



حضرت سید نے انتقال کے چھ سال بعد ان کو خواب میں فرمایا کہ

"مقصود حق است و آں غیر متناہی پس عمر متناہی خود را تمام در طلب صرف باید کرد و مقصود بدست باید آورد"[1]

اس خواب کے بعد مرزا صاحب حضرت حاجی[2] کی خدمت میں، جو ان کے شیخ الحدیث تھے، پہنچے، انھوں نے فرمایا تم نے تو حضرت سید سے علیٰ سبیل البصیرۃ کسبِ سلوک کیا ہے اور مجھ میں قوتِ کشفی اتنی نہیں ہے، چنانچہ شیخ حاجی سے مرزا صاحب نے صرف کتبِ احادیث پڑھیں، لیکن خود مرزا صاحب کا بیان ہے کہ اثنائے سبق میں فیض باطن بھی ان کو ضرور پہنچتا تھا،[3]

اس کے بعد مرزا صاحب، حضرت شاہ گلشن[4] رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں بغرض استفادہ

[1] معمولات مظہریہ ص ۱۶ [2] حاجی محمد افضل سیالکوٹیؒ عالم متبحر اور فاضل دانشور تھے، حجۃ اللہ نقشبند فرزند و خلیفہ حضرت محمد معصوم سے دس سال تک استفادۂ فیوض باطنی کیا تھا، بارہ سال تک حضرت شیخ عبد الاحد فرزند و خلیفہ شیخ محمد سعید فرزند و سجادہ نشین حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں رہ کر مقامات عالیہ طے کئے، علوم معقول و منقول و حدیث بھی حضرت شیخ عبد الاحد سے حاصل کئے تھے، شیخ سالم بصری ثم المکی سے بھی حدیث پڑھی تھی، حاجی صاحب کا استغراق بہت قوی تھا، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے حدیث حاجی صاحب ہی سے پڑھی تھی،

حاجی صاحب کو کتابوں سے بہت شغف تھا، نقد کی صورت میں جو ہدیہ ملتا اسکی کتابیں خرید لیتے اور وقف کر دیتے، ایک بار کہیں سے پندرہ ہزار روپئے آئے، انھوں نے پوری رقم کی کتابیں خرید لیں اور حسب دستور وقف کر دیا، حاجی صاحب نے سنہ ۱۱۴۶ھ میں وفات پائی، مزار شریف حضرت خواجہ باقی باللہ کے مزار کے متصل ہے،

[3] معمولات مظہریہ ص ۱۶،

[4] حضرت شاہ گلشن، حضرت شیخ عبد الاحد مجددی نبیرۂ حضرت مجدد کے خلیفہ تھے، کمال ظاہری و باطنی، علوم سنت و طریقت و حقیقت و زہد و ورع و تقویٰ میں کمال حاصل تھا، تین تین دن کے بعد کھانا کھاتے، تیس سال ایک کمل میں گذار دیئے، جامع مسجد دہلی میں سکونت تھی، جب پیاس لگتی تو مسجد کے حوض میں سے دو تین چلو پانی، جو اکثر گرم ہوتا پی لیتے، سنہ ۱۱۵۲ھ میں انتقال فرمایا،

حاضر ہوئے، وہاں پہونچ کر معلوم ہوا کہ شاہ صاحب نے اپنے مریدوں کو حضرت محمد زبیر قدس سرہ
کو سپرد کر دیا ہے، مرزا صاحب ان کی خدمت میں پہنچے، انھوں نے فرمایا کہ تم کو حضرت سید سے نسبت
صحیحہ مل چکی ہے، اسی کو محفوظ رکھنے کی کوشش کرو، اس کے بعد مرزا صاحب حضرت حافظ سعد اللہ[2]
کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بارہ سال تک اُن سے استفادہ کیا،

حضرت حافظ سعد اللہ کے انتقال کے بعد جب حضرت شیخ محمد عابد سنامی[3]، سرہند سے شاہجہاں آباد
آئے تو مرزا صاحب ان کی خدمت میں حاضر ہوئے،

"حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ تمامی بشارات حضرت سید را مسلّم داشتہ از ہماں نقطہ آخر
ولایت علیا و آغاز کمالات نبوت کسب مقامات کنانیدند و در عرصہ ہفت سال بحقیقت صلوٰۃ رسانیدند"

اس کے بعد "بطور سیر مرادی" ایک بار پھر ابتدا سے انتہا تک ایک سال کے اندر ان تمام
مقامات کو طے کرایا، اور خصوصیات مجددیہ میں محبت و محبوبیت، غنیمت کبریٰ وغیرہ کی بشارت دی
اور طریقۂ قادریہ، چشتیہ و سہروردیہ کی بھی اجازت دی، اس دوران میں اکثر مبتدیان خانقاہ نے
حضرت میرزا سے کسب فیض کیا،[1] مرزا صاحب حضرت شیخ عابد کی خدمت میں اُن کی وفات
(۱۱۶۰ھ) تک رہے،

مشیخت و ارشاد | تقریباً تیس سال تک مشائخ نقشبندیہ و مجددیہ سے کسب فیض کرنے کے بعد

---

[1] حضرت محمد زبیر حضرت محبت اللہ نقشبندی کے خلیفہ تھے، بہت عبادت گذار تھے، ۱۱۵۵ھ میں انتقال فرمایا،
[2] حضرت حافظ سعد اللہ، حضرت محمد صدیق فرزند و خلیفہ حضرت محمد معصوم کے خلیفہ ہیں، تیس سال تک ان کی خدمت
میں رہ کر مقامات عالیہ طے کئے، حافظ صاحب کا لقب خانقاہ میں "سید الصوفیہ"، تھا، مزاج میں خاکساری
فروتنی بہت تھی، علوم ظاہری میں کوئی خاص مرتبہ نہ تھا، لیکن نسبت باطنی بہت قوی تھی، ۱۱ر شوال ۱۱۵۲ھ کو انتقال
فرمایا، مزار شریف بیرون اجمیری دروازہ، شاہجہاں آباد میں ہے، [3] حضرت شیخ عبد اللہ کے خلیفہ تھے، سلسلۂ نسب
حضرت ابوبکر صدیقؓ سے ملتا ہے، بہت کثیر العبادت اور کثیر الذکر تھے، حرمین شریفین کو پیادہ تشریف لے گئے تھے،
۸ر رمضان المبارک ۱۱۶۰ھ کو انتقال فرمایا [4] معمولات مظہریہ ص۱۵،



جب مرزا صاحب خود صاحب کمال ہو گئے تو مسند ارشاد و ہدایت پر بیٹھے اور اپنا سارا وقت طالبان
حق کی رہنمائی کے لئے وقف کر دیا، ان کی ساری دلچسپیاں مریدوں اور اُن کی فلاح و بہبود کیلئے
وقف تھیں، ۳۵ سال تک خانقاہ مجددیہ کو رونق بخشی، کوئی دن ایسا نہیں جاتا تھا کہ تقریباً سو
طالبان حق کو توجہ نہ دیتے رہے ہوں، چنانچہ خود فرماتے ہیں :-

"درحلقہ ہر دو وقت قریب صد کس حاضر میشوند، حیرانم کہ قوت توجہ از کجی می آید"

(کلمات طیبات، مکتوب سی و پنجم)

ابتدا میں کچھ دنوں تک درس و تدریس کا بھی سلسلہ رہا، لیکن جب نسبت باطنی نے غلبہ
کیا تو یہ شغل ختم ہو گیا[1] اور صرف رشد و ہدایت کا سلسلہ باقی رہا، مرزا صاحب کا آفتاب رشد و ہدایت
صرف دہلی تک محدود نہ تھا، بلکہ اس کی شعاعیں دہلی سے باہر دوسرے علاقوں کو بھی منور کر چکی
تھیں، وہ باوجود شکایت ضعف پیری دہلی سے باہر دوسرے علاقوں میں خصوصاً روہیلکھنڈ اکثر
جایا کرتے تھے، چنانچہ ایک مکتوب میں خود فرماتے ہیں کہ

"انشاء اللہ تعالیٰ در ماہ صفر ارادہ سنبھل دارم کہ از چندیں سال ہر سال اتفاق می افتد سیر"

(مکتوب بست و ہفتم)

ایک اور مکتوب میں فرماتے ہیں :-

"فقیر از سیر امروہہ و مرادآباد فارغ شدہ است و قصد تماشائے شاہجہانپور دارد،
انشاء اللہ تعالیٰ عنقریب می رسد، دو سہ مقام در بریلی کردہ روانہ پیشتر می شود و پنج و شش مقام
در شاہجہانپور نمودہ مراجعت بہ سنبھل می نماید بعد ازاں بہ دہلی می رود، و باوجود ضعف پیری
ایں حرکت عنیمت را برخود پسندیدن بنا بر اغراض صحیحۂ اخرویہ است کہ خدا امید اند اشتیاق بقدر

---

[1] معمولات مظہریہ ص۱۷،

اشتیاقِ صاحبان است۔" (مکتوب پنجاہ و دوم)

مرزا صاحب کے مریدوں میں روہیلوں کی تعداد نسبتہً زیادہ تھی، چنانچہ خود فرماتے ہیں:۔

"ہجوم روہیلہ ہا برائے اخذ طریقہ بحدیست کہ تمام روز توجہ فرصت نیست۔" (مکتوب ہفتاد و چہارم)

اسی مکتوب میں مندرجۂ ذیل عبارت بھی ملتی ہے، جس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ ان کے حلقۂ مریدین میں روہیلوں کی تعداد زیادہ تھی، لکھتے ہیں:۔

"مردم از قوم روہیلہ اکثر و از مردم ہندی کمتر اخذ طریقہ علیہ نمودند و منور و متاثر گردیدند۔"

غالباً یہی وجہ ہے کہ جب دہلی کی حالت روز بروز بد سے بدتر ہوتی جارہی تھی تو مرزا صاحب کے دل میں ایک مرتبہ یہ خیال پیدا ہوا کہ دہلی چھوڑ کر اور کہیں اپنا مسکن بنائیں، چنانچہ ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

"بجذب قسمت و جاذبۂ احباب فقیر از دہلی بسنبھل رسید و امروہہ و مرادآباد را ہم دید تا بانتخاب پردازد کہ رخت اقامت در کجا اندازد و متعلقان را طلبیدہ نگاہ دارد کہ از تشویشات ہر روزۂ دہلی تنگ آمدہ ام ....... مردم سنبھل و مرادآباد و امروہہ کہ سہ بلاد سماجت نمودند کہ اینجا باید بود جا و بنا و حقوق نواب رشاد خان بہادر سلمہ ربہ نگذاشت کہ قصد جائے دیگر کنم و طالبان طریقہ نیز دریں شہر بسیار اند، عزم اقامت نمودہ ام برائے طلب متعلقان فرستادم، آنہا عذر ہائے مسموع نوشتند، ناچار بمراجعت دہلی اتفاق افتاد۔" (مکتوب چہلم)

اوپر بتایا جاچکا ہے کہ مرزا صاحب تقریباً سو آدمیوں کو ہر روز توجہ دیتے تھے، ان کے ایک اور مکتوب سے پتہ چلتا ہے کہ مریدوں کی بہت کثرت تھی، فرماتے ہیں:۔

"میر مبین خان را کہ از مقامات مصطلحہ گذشتہ و اجازت مطلقہ یافتہ و در توجہ گرمی بسیار دارند و اتفاقاً دریں ایام از شہر برائے دیدن فقیر رسیدہ بودند، بجائے خود دریں بلاد گذاشتہ ام مردم از صحبت ایں بزرگ زادہ بسیار فیض می گیرند، و خیلی رجوع کردہ اند اما کاریک کس



نیست کہ از عہدۂ ایں قافلہ برآید، بخاطر دارم کہ شما را ہم طلبیدہ بعض شہر را بہ شما و بعض را بہ میر مبین خان تفویض نمایم۔" (مکتوب ہفتاد و چہارم)

مولوی ثناء اللہ سنبھلی کو ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"شما در آنجا رفتہ جائے فقیر گرم سازید کہ در آں ضلع عالمی فہمیدہ و درویشی جا بجا نسبت (مکتوب بست و ششم)

آخر عمر میں مرزا صاحب کی صحت خراب اور قویٰ کمزور ہوگئے تھے، اس کے اشارات بھی ان کے مکتوبات میں ملتے ہیں، ایک مکتوب میں ارقام فرماتے ہیں:۔

"قویٰ آں قدر تحلیل رفتہ کہ طاقتِ قیام در نماز فرض ماندہ است و بس" (مکتوب بست و ہفتم)

ایک اور خط میں ہے،

"ضعف پیری ست معہ امراض و عوارض۔" (مکتوب سی و یکم)

ایک دوسرے مکتوب میں ہی:۔

"تحریر جواب خطوط از ضعف نمی توانم نمود، حالا بدوستان نوشتہ ام کہ امید وار و منتظر جواب نباشند کہ معذورم و مردہ ام و مرا طاقت رفتن بمسجد جامع بروز جمعہ نماندہ است ....... ضعف و ناتوانی از حد گذشتہ است و امراض متعددہ مستولی شدہ، نماز فرض ایستادہ خوانم و بس،، (مکتوب سی و پنجم)

ایک دوسرے صاحب کو لکھتے ہیں:۔

"عمر آخر است و ضعف و پیری از حد زیادہ، خدا خاتمہ بخیر گرداند، توقع ملاقات تہا ضعیف است اما از قدرت الٰہی امید قویست۔" (مکتوب پنجاہ و ہفتم)

یک پیری و صد عیب، بڑھاپے میں صرف ہاتھ پیر ہی نہیں کمزور ہو جاتے ہیں، بلکہ دوسرے

اعضا بھی جواب دیدیتے ہیں، چنانچہ درازیٔ عمر کے باعث مرزا صاحب کی بصارت میں بھی کمی آگئی تھی، خود فرماتے ہیں:۔

"از ضعف بصر، وقت در تحریر نماندہ و طاقت تحریر ہم نہ، یاران بعد ازیں از جواب خطوط معذور دارند" (مکتوب سی و یکم)

لیکن اس ضعف و ناتوانی کے باوجود وہ اپنے کام میں برابر لگے رہے، اور اپنے مریدوں کو فیوض باطنی پہنچاتے رہے، خود فرماتے ہیں:۔

"چہ کنم از ضعف پیری و کثرت تعلیم طریقہ کہ روزی صد کس را بل زیادہ ازآں توجہ اتفاق می افتد" (مکتوب بست و ہفتم)

ایک دوسرے مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"فقیر معہ توابع باکمال ضعف و ناتوانی زندہ است و ہنوز قریب صد کس را ہر دو وقت توجہ میسر می آید" (مکتوب ہفتاد و پنجم)

ارشاد و ہدایت کا یہ سلسلہ بذریعہ مکاتیب بھی جاری رہتا تھا، ایک مرید کو تنبیہ کرتے ہیں:

"فقیر در معاملہ معلوم کردم کہ والدۂ شما در باطن ناخوش اند، ناخوشی والدہ موجب خسارت دنیا و آخرت است" (مکتوب سی و ہشتم)

ایک دوسرے مکتوب میں ارقام فرماتے ہیں:۔

"نارسیدن فقیر یاران طریقہ کہ در دہلی ہست اند بخدمت مولوی عبد الرزاق، کہ بظاہر و باطن لیاقت ارشاد و تعلیم طریقہ دارند، رجوع نمایند و صحبت ایشان را غنیمت دانند، عزیزان دیگر کہ از فقیر استفادہ کردہ اند و اجازت یافتہ صحبت آنہا ہم خالی از فائدہ نیست" (مکتوب چہل و نہم)

ایک مرید کو یوں نصیحت فرماتے ہیں:۔



"باید بر خوردار بظاہر مقید بشرع و در باطن مشغول بذکر طریقہ باشند کہ فلاح دو جہان دریں منحصر است" (مکتوب سی و ہفتم)

قاضی ثناء اللہ پانی پتی کو تنبیہ فرماتے ہیں،

"برادر من اعجب کاریست کہ ہر واحد از مردم پانی پت لبریز شکایت شما می آید معلوم نیست چہ عمل از شما واقع میشود، اگر راستی و دیانت شما باعث آزار مردم است از ان راستی بگذرید، برائے حفظ حرمت بتاویل ہم خاطر مردم مرعی دارید کہ طریقہ و پیران طریقہ بدنام میشود برائے خاطر لیئماں دیگراں را آزردہ کردن و خود را بدنام ساختن باین کمالات ظاہری و باطنی دور از عقل است" (مکتوب ہفتاد و ہفتم)

مریدوں کی تربیت باطنی کے علاوہ جہاں تک ہو سکتا مرزا صاحب ان کے دنیاوی امور میں بھی کوشش پیروی سے دریغ نہ کرتے، لیکن یہ سفارشیں زیادہ تر اپنے مریدوں اور دوستوں ہی سے کرتے، اس لئے کہ مرزا صاحب نے امرا و روسا اور ارباب اقتدار سے کبھی کوئی تعلق نہ رکھا،

ظفر علیخاں خلف نواب ارشاد خاں بہادر سے مرزا صاحب کو خاص طور پر محبت تھی، انکی تعریف میں لکھتے ہیں کہ

"جواہر پارہ ایست کہ قیمت ندارد، فقیر بے سبب گرفتار او نیستم، خوبہاے او را شناختہ ام"

ان کی سفارش کسی سے ان الفاظ میں کرتے ہیں:۔

"بخدمت تصدیع میدہم کہ بحق دوستیہائے قدیم و اتفاقی کہ بر فقیر مبذول است شفقتی کہ لائق بزرگیہاے آں مہرباں باشد در حق ایں جگر گوشہ کہ مرا عزیز تر از جان است بذل فرمایند" (مکتوب چہل و چہارم)

اسی طرح ایک مکتوب میں لالہ برج لال کی سفارش ہے، لالہ صاحب تلاش معاش میں نکلے گئے ہیں، لالہ صاحب کے متعلق مرزا صاحب نے یہ الفاظ فرمائے ہیں :-

"لالہ برج لال نام جوانی از دوستان مقرری کہ در حسن سلیقہ متصدیگری و صحبت داری بزعم فقیر نظیر ندارد و عمدہ زادہ و عمدۂ روزگار بودہ است" (مکتوب سی و ششم)

اسی خط میں آگے چلکر ان کو "نسخۂ صحیحۂ آدمیت" کے لقب سے یاد کرتے ہیں،

غرض اسی طرح مختلف مریدوں اور دوستوں کی سفارش اپنے ذی استطاعت دوستوں اور مریدوں سے کرتے ہیں،

---

## خیّام

خیام کے سوانح، تصنیفات اور فلسفہ پر تبصرہ، اور فارسی رباعی کی تاریخ اور رباعیات خیام پر مفصل مباحث اور آخر میں خیام کے چھ عربی و فارسی رسالوں کا ضمیمہ اور اس کے قلمی رباعیات کے ایک نسخہ کی نقل شامل ہے، خیام کے مباحث پر اس سے زیادہ مفصل، مکمل اور محققانہ کتاب اب تک نہیں لکھی گئی، قیمت مجلد للعہ، غیر مجلد ہے، ۵۲۰ صفحے از مولانا سید سلیمان ندوی،

## انتخابات شبلی

مولانا شبلی کی شعر العجم اور موازنہ کا انتخاب جس میں کلام کے حسن و قبح اور عیب و ہنر اور شعر کی حقیقت اور اصول تنقید کی تشریح کی گئی ہے، قیمت عہ، ضخامت ۲۲۰ صفحے،

"منیجر"



# فارسی کے چند قدیم شعراء

از جناب غلام مصطفیٰ خاں صاحب ایم اے (علیگ) لکچرر کنگ ایڈورڈ کالج امراؤتی

(۳)

ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ ۵۵۱ھ ۱۱۵۶ء میں جب مقامات حمیدی تالیف ہوئی انوری نے اسکی تعریف میں کچھ اشعار لکھے تھے، لیکن اس سال کے بعد اور ۵۵۳ھ ۱۱۵۸ء کے پہلے ضرور کوئی ایسا وقت گذرا ہے جب کہ انوری نے مدح سرائی کچھ عرصہ کے لئے روک دی تھی، اس کا ثبوت ہم کو صاف طور پر کلیات میں ملتا ہے :-

نیستم بیگانہ از اعمال و احکام نجوم     در بیان او بغایت اوستاد و ماہرم
من ز لقمان و فلاطون نیستم کم در حکم     ور ہمی باور نہ داری رنجہ شو من حاضرم
با بزرگان مستفیدم با فرودستان مفید     عالم تحصیل را ہم وارد و ہم صادرم
غصہا دارم ز نقصان از ہمہ نوعے و لیک     زیں یکے آوخ کہ نزدیک تو مرد شاعرم
گرچہ دربستم در مدح و غزل یکبارگی     ظن مبر کز نظم و الفاظ معانی قاصرم
ایں ہمہ بگذار با شعر مجرد آمدم     چوں سنائی نیستم آخر نہ چوں صابرم
ہر یکے آخر از ایشاں بے کفافے نیستند     ایں منم کز مفلسی چوں ذرہ روشن ظاہرم

آخری شعر ہے :-

قدر من صاحب قوام الدین حسن داند از انک     صدر او را یادگار از ناصر الدین طاہرم

یہ قوام الدین حسن دراصل ناصر الدین ابو الفتح طاہر (بن فخر الملک بن نظام الملک) (المتوفی ۵۴۸ھ / ۱۱۵۳ء) کے بیٹے ہیں، ان کے متعلق تاریخ بیہق (ص۱۰۸) میں ہے:-

"اما قوام الدین الحسن بن ناصر الدین کہ وزارتِ سلطان سلیمان و وزارتِ سلطان محمود خان بمکان اوآراستہ بود، در بیہق مقیم است من سنۃ ثلاث و خمسین و خمس مائۃ الیٰ یومنا ہذا (اختتام کتاب ۵۶۳ھ بیہقی)"

سلطان سلیمان (بن محمد بن ملک شاہ؟ المتوفی ۵۵۶ھ / ۱۱۶۱ء) کے عہد میں اس قوام الدین حسن کی وزارت کا وقت مجھے معلوم نہیں ہوسکا، لیکن سلطان محمود خاں (بن محمد خاں بن بغرا خاں المتوفی ۵۵۹ھ / ۱۱۶۴ء) جو سنجر کا بھانجا تھا اور سنجر کی قید اور وفات کے بعد اس کا قائم مقام ہوا، ضرور اس کی وزارت سے مستفید ہوا ہوگا، اور یہ وزیر وزارت کے بعد ۵۵۳ھ / ۱۱۵۸ء سے تاریخ بیہق کے بیان کے مطابق بیہق میں مستقل طور پر مقیم ہوگیا، اس سے صاف ظاہر ہے کہ انوری نے جیسا کہ اوپر والے پانچویں شعر سے معلوم ہوتا ہے ۵۵۳ھ / ۱۱۵۸ء کے پہلے ضرور کسی وقت مدح سرائی اور غزل گوئی چھوڑ دی تھی اور وہ وقت ۵۵۱ھ / ۱۱۵۶ء کے بعد ہوگا، کیونکہ اس سال مقاماتِ حمیدی کی تالیف پر انوری نے اشعار لکھے تھے، مدح سرائی ترک کرنے کی وجہ غالباً ممدوح کو وفاتِ سنجر (المتوفی ۵۵۱ھ / ۱۱۵۶ء) کا غم دکھانا ہے، یا خود ممدوح کے والد ناصر الدین ابو الفتح طاہر (المتوفی ۵۴۸ھ / ۱۱۵۳ء) کی وفات کا اثر ظاہر کرنا ہے، جس سے شاعر نے یکبارگی شاعری چھوڑ دی، یا انوری شاعری کرتے کرتے اکتا گیا ہو، تنقید میں یہ صحیح فرمایا گیا ہے کہ سلطان احمد پیروز شاہ نے انوری کو ترمذ بلایا تھا، اس کی تاریخ کلیاتِ انوری (ص۲۷۳) میں یہ ہے:-

| | |
|---|---|
| اندر آمد ز در حجرۂ من نیم شبے | روز بہمنجنہ یعنی دوم بہمن ماہ |
| سال بر پانصد و سی سہ ز تاریخ عجم | گفت برخیز کہ از شہر بروں شد ہمراہ |

له مجلہ نفیسی، ورق ۲۵۱ ب، بانکی پور ۲۵ فٹ بر فیروز شاہ کی ہجرتِ بلخ کے متعلق اشعار ہیں، جہاں وہ پھر آیا ہے،



علامہ شبلی نے بھی یہی قصیدہ اور تاریخ نقل کی ہے، لیکن سہواً ایک جگہ اس تاریخ عجم کو ۵۳۳ھ لکھ دیا ہے جو چنداں قابلِ اعتراض نہیں تھا، کیونکہ سہو ظاہر ہے، تنقید میں اس تاریخ عجم (یزدجردی) کی مطابقت ۵۷۰ھ / ۱۱۷۶ء سے کی ہے، اور قیاس سے بھی یہی زمانہ صحیح معلوم ہوتا ہے، کیونکہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ ہجو بلخ والا معاملہ ۵۵۹ھ / ۱۱۶۴ء کے قریب ہی واقع ہوا تھا، اور اس پر اتفاق بھی ہے کہ ترمذ کو انوری اس واقعہ کے بعد گیا تھا، کیونکہ اس کے پہلے وہ بلخ ہی میں دس سال کے قریب رہ چکا تھا،

| | |
|---|---|
| در مدت دہ سال کہ ایں گوشہ وسکنہ | در قبۂ اسلام مرا مستقر آمد (کلیات ۲۲۶) |

اور یہ قیام جیسا کہ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں ۵۴۹ھ کے بعد ہی سے شروع ہوسکتا تھا، انوری کی طلبی کا زمانہ ایک جگہ اس طرح مذکور ہے:-

| | |
|---|---|
| مثالِ عالیِ دستور چوں بہ بندہ رسید | قیام کردم و بوسید و بر دو دیدہ نہاد |
| مرا بخدمتِ شہ خواندہ کہ خدمتِ او | کند سپہر کہ ہست او زمانہ را بنیاد |
| عمادِ دولت و دیں آنکہ حصنِ دولت و دیں | بس از و فور خرابی شدند از و آباد |
| شہِ مظفر فیروز شہ کہ فتح و ظفر | ز سایۂ علم و شعلۂ سنانش زاد |
| بروزِ یازدہم از رجب روانہ شوم | کہ کوچ از شہر تموز است و پنج از مرداد |
| اگر ستارہ بہ اتمامِ عزم باشد رام | وگر زمانہ بہ اعطائے عمر باشد زاد |
| بشکل باد روم زاں کہ باد در حرکت | بیاورد ز بیابانِ آب جیحوں یاد |
| چو زیرِ ران کشم آں مرکبے کہ ایضِ اُم | کہ در ریاضتِ او باد را بود استاد |
| عنانِ صولتِ جیحوں چناں فرو گیرم | کہ از رکاب گرانم برآورد فریاد (کلیات ۲۲-۱۲۰) |

یعنی جلال الوزراء (وزیر فیروز شاہ) نے بادشاہ کے ایماء سے انوری کو ترمذ طلب کیا تھا، اور پانچویں شعر میں ۱۱ رجب کو انوری کی روانگی کی تاریخ ملتی ہے جو ۵ مرداد کی بجائے "خرداد" (یزدجردی ماہ)

ہی کے مطابق ہو سکتی تھی، لیکن یہ تاریخ ضرور ٹل گئی ہوگی، کیونکہ ترمذ پہنچنے کا زمانہ تقریباً ۶ ماہ بعد یعنی
کا مہینہ تھا[1]، جیسا کہ مذکور ہو چکا ہے، تنقید میں ایک جگہ فرمایا گیا ہے کہ ص۱۵۰ پر ذیل کا قصیدہ کسی
شاعر نے انوری کی مدح میں لکھا تھا،

اے در ہنر مقدم اعیانِ روزگار — در نظم و نثر اخطل و حسانِ روزگار

لیکن میرا خیال ہے کہ وہ اشعار انوری ہی کے ہیں اور ایک ہی سلسلے میں آخر تک ہیں،
اس کے تین شعر قابلِ توجہ ہیں:-

داند ہنر ان بقسم انوری و لیک — بر خم ہمی چہ خواند خاقانِ روزگار
اے خر سوارہ پیشِ کسے لاف می زنی — کو شد سوار فضل بمیدانِ روزگار
نے نے بمدح باز شو و پس بگوے زود — کاے ثابت از وجود تو ارکانِ روزگار

شعر العجم میں غالباً کاتب کی بے اعتنائی سے ابوطالب نعمہ، صفی الدین عمر مفتی، تاج الدین احمد
محتسب اور نظام الدین احمد کے نام کچھ تبدیل ہو گئے تھے، جن کی صحت بے شک ضروری ہے،
یہ وہ لوگ ہیں جن کو براؤن (ج ۲ ص۳۸) اور مولانا شبلی دونوں نے انوری کے نجات دہندگان
میں شمار کیا ہے، لیکن تنقید میں صحیح فرمایا ہے کہ شاعر کا مقصد صرف اس قدر ہے کہ جب بلخ میں
ایسے ایسے مشاہیر فضلا و علما جمع ہیں تو ان کی موجودگی میں بھلا میری کیا مجال ہو سکتی ہے کہ
بلخ کی ہجو کا خیال بھی دل میں لاؤں[2]، اور اس کے ثبوت میں دو شعر بھی دئے ہیں،
ان بزرگوں میں نظام الدین احمد کو پروفیسر شیرانی صاحب نے قاضی القضاۃ کہا ہے اور
سوگند نامے سے یہ شعر پیش کئے ہیں:-

[1] مجھے خود اس یزدجردی تاریخ کی مطابقت کے لئے عیسوی اور ہجری سال کی تحقیق نہیں ہے، اس کے لئے Stone کی کتاب Manual اس صوبے میں سننے میں بھی نہ آئی ہوگی جبکہ یہاں معمولی کتابیں بھی نہیں ہیں،



افتخارِ خاندانِ مصطفیٰ در بلخ و من — کردہ ام در خدمتش حسانی و ہم بوتری
آں نظامِ دولت و دیں کا نتظامِ عدلِ او — در دلِ اغصان کند بادِ صبا را رہبری
در پناہِ سدۂ جاہ و رعیت پرورش — بر عقابِ آسمان فرمان دہد کبکِ دری
ہم نبوت در نسب ہم پادشاہی در حسب — کو سلیماں تا در انگشتش کند انگشتری
مسندِ قاضی القضاۃِ شرق و غرب افراشتہ — آں کہ ہست از مسندش عباسیاں را برتری
آنکہ پیشِ کلک و طبعش آں دو سحرِ آنگہ حلال — صد چو من ہستند چوں گوسالہ پیشِ سامری
آب و آتش را اگر در مجلسش حاضر کنند — از میانِ ہر دو بر دارد شکوہش داوری

ان اشعار میں سے آخری تین شعر میرے خیال میں قاضی القضاۃ حمید الدین کی مدح میں ہیں،
کیونکہ نظام الدین کو پہلے شعر میں "سید" کہا ہے، اور ان تین شعروں میں سے دوسرا مصرع کسی عباسی
کی مدح میں ہے، یعنی حمید الدین، جن کو "قاضی قضاۃ" کے خطاب سے ص۶۲ پر بھی یاد کیا ہے، ع

قطعۂ صدرِ اجل قاضی قضاتِ شرق و غرب

اور نظام الدین کی مدح میں تو سوگند نامے کا یہ شعر بھی کافی مبالغہ پیدا کر دیتا ہے:-

بازوے برہاں ز تقدیرِ نظام الدین قوی ست — آنکہ از تعظیم کردے جبرئیلش چاکری

علاء الدین غوری کے دربار میں انوری کی طلبی کا واقعہ مولانا شبلی کی طرح پروفیسر براؤن
(جلد دوم ص۳۸۳ و ص۳۸۲) نے بھی نقل کیا ہے، لیکن تنقید میں اس کی صحت سے انکار کیا گیا ہے، ثبوت
یہ دئے ہیں، (۱) بروایتِ مشہور علاء الدین، انوری سے صاف نہیں تھا (۲) انوری ۵۴۶ھ میں
پیروز شاہ کے پاس ترمذ جاتا ہے اور اس کی مدح عرصہ تک کرتا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس
سنہ سے ایک عرصہ بعد تک وہ مدح سرائی اور شعر گوئی سے تائب نہیں ہوتا، اور (۳) علاء الدین
غوری ۵۵۶ھ میں وفات پاتا ہے، اس لئے انوری کی عزلت نشینی کے زمانہ تک اس کا زندہ رہنا

ناممکن ہے" اور پھر یہ بھی فرمایا ہے کہ وہ بادشاہ جس نے طلب کیا تھا اور جس کو انوری نے معافی نامہ لکھ بھیجا تھا وہ غوری کے علاوہ کوئی اور تھا، جس نے ۵۹۵ھ والے اشعار انوری کو لکھے تھے، مجھے خود اس واقعہ کے متعلق شک ہے، لیکن اسی کے ساتھ مذکورۂ بالا دلائل میں بھی شک ہے، وہ "روایتِ مشہور"، مجمل فصیحی میں ۵۴۷ھ کے تحت اس طرح ہے جو اجمالاً عرض ہے:۔

سلطان سنجر کے مقابلے کے لئے علاء الدین حسین، شمس الدین محمد اور علی چتری مل کر دراوبر آئے، لیکن ان لوگوں کو شکست ہوئی، علی چتری قتل کر دیا گیا اور شمس الدین کو پچاس ہزار دینار پر رہا کر دیا، لیکن علاء الدین حسین نظر بند رہا، ایک رات سنجر نے اس کو قیمتی جواہرات کا ایک طبق دیا، اُس نے یہ رُباعی فی البدیہہ کہی:۔

| | |
|---|---|
| بگرفت و نہ کشت شہ مرا در صفِ کیں | با آں کہ بدم کشتنی از روے یقیں |
| واں گہ بہ طبق می دہدم درِ ثمیں | بخشایش و بخششم چناں کرد و چنیں |

سنجر[1] خوش ہوا تو علاء الدین نے جانے کی اجازت مانگی، انوری نے کہا:۔

| | |
|---|---|
| چوں بندگی تہمت نمی آید خوش | با ملک چہ آب و دولتے چوں آتش |
| برخیز و بسیج آں جہان خوش خوش | و آنجا علف و گلخنِ دوزخ می کش |

علاء الدین کو اس بات سے بہت خفت اور ناراضی ہوئی، سنجر کی وفات کے بعد فخر الدین خالد سے ایک خط انوری کو لکھوایا کہ وہ غزنین آئے، لیکن اس شاعر نے ایک خط علیحدہ بھی لکھا، جس میں یہ شعر تھے:۔

| | |
|---|---|
| اے آنکہ در ہنر بہمہ جا رسیدۂ | نیک و بدِ زمانہ عنداردیدۂ |

[1] مخطوطہ بانکی پور ورق ۱۲۷ ب [2] صبح صادق ورق ۱۲۷۹ میں سنجر کی خوشنودی کی وجہ یہ ہے کہ غوری نے اس کے پاؤں کے خال کا بوسہ لیا اور ایک اور رباعی کہی،



| | |
|---|---|
| اصلت ز قائن است و نشستت بہ کوشنگ | دانم کہ نیم بیت دگر را شنیدۂ |

انوری سمجھ گیا کہ جانا مناسب نہیں ہے، چنانچہ اُس نے وہ قطعہ لکھ بھیجا، ع

کلبۂ کاندر و بروز و لشب الخ

اس قطعہ میں انوری کو قائنی کہا ہے، حالانکہ خاوران اس کا وطن تھا، ممکن ہے اس کے آباؤ اجداد کی اصل قاین کی رہی ہو، بہرحال اگر یہ قصہ صحیح ہے تو گویا انوری کی طلبی کے لئے (انتقام کی خاطر) یہی ایک معقول بات ہو سکتی تھی، اس قصہ میں یہ بھی لکھا ہے کہ وہ انوری کو سنجر کی وفات کے بعد اور وہ بھی غزنین میں بلوانا چاہتا تھا، اور یہی زمانہ یعنی ۵۵۱ھ کے بعد اور ۵۵۳ھ کے پہلے ایسا تھا جب کہ انوری نے کچھ عرصے کے لئے یقیناً شاعری اور مدح سرائی چھوڑ دی تھی، اور اس کا ثبوت ہم اوپر دے چکے ہیں، اور پھر ۵۹۵ھ والے شعر جو کسی بادشاہ کی طرف سے ہیں ہمارے خیال کی تائید کرتے ہیں، کیونکہ علاء الدین غوری کے اشعار کئی جگہ ملتے ہیں، ایک رباعی تو اوپر مذکور ہوئی، اور دو نظمیں غزنین کے تباہ کرنے کے زمانہ میں اس نے لکھی تھیں، جو طبقاتِ ناصری میں مذکور ہیں، ایک رباعی اور ملتی ہے جو اُس نے بہرام شاہ کے بیٹے خسرو شاہ کو تکین آباد کے متعلق لکھ بھیجی تھی، اور جو فرشتہ (۵۲) اور مجمل فصیحی (ورق ۱۶۲ الف) میں ملتی ہے، اس لئے ممکن ہے کہ وہ شعر بھی اسی بادشاہ کے ہوں، بہرحال جیسا کہ میں نے عرض کیا، اس واقعہ میں شک ضرور ہو سکتا ہے،

اب انوری کے چند ممدوحوں کے متعلق کچھ عرض کرتا ہوں، انوری کے خاص ممدوح وزرائے سنجر میں سے ناصر الدین ابو الفتح طاہر بن فخر الملک بن نظام الملک تھے، جو قوام الدین ابو القاسم کے معزول ہونے پر مقرر ہوئے تھے، قوام الدین ابو القاسم کے قتل کی تاریخ مجمل فصیحی (ورق ۱۶۳ الف) اور تاریخ صبح صادق (جلد سوم، ورق ۱۰۷ ب بانکی پور) میں ۵۲۸ھ ہے، لیکن ناصر الدین طاہر کی تاریخ

[1] قوام الدین نے عین القضاۃ ہمدانی کو جو قتل کرایا تھا اس کی تاریخ خزینۃ الاصفیار (جلد ۲ ص ) (باقی حاشیہ ص ۲۸۲ پر)

وزارت کے متعلق آثار الوزراء (ورق ۱۳۳ الف بانکی پور) تک میں غلط بیانی ہے :-

" ناصر الدین طاہر ....... بعد از قوام الدین ابو القاسم، وزارتِ سنجر تقلد نمود ، ودراں سال سلطان را نکبتِ غز برسید و ایں وزیر از منصب تمتعے نیافت و در ناکامی وفات یافت "

تاریخ صبح صادق (ورق ۱۰۶۲ الف) میں بھی بالکل یہی ہے :-

" (ناصر الدین) بعد از قوام الدین ابو القاسم در گزینی وزیر سنجر شد و درہماں سال سلطان بدستِ غزان گرفتار گشت و ناصر الدین از وزارت تمتعے نیافتہ ہمدراں اوان درگزشت "

لیکن حقیقت یہ ہے کہ ناصر الدین طاہر ۵۴۸ھ / ۱۱۵۳ء کے بہت پہلے وزیر ہو چکا تھا، مثلاً ۴ ذی الحجہ ۵۴۰ھ (یک شنبہ ۱۶ مئی ۱۱۴۶ء) کو انوری نے اس کی مدح میں لکھا ہے :-

بحکم دعویِ زیج و گواہیِ تقویم — شبِ چہارم ذی حجہ وسنِ ثا میم ۵۴۰
شبے کہ بود شبِ ہفدہم ز آباں ماہ — شبے کہ بود نہم شب تیر ماہِ قدیم
نمازِ خفتنِ یک شنبہ از مہِ بہمن — کہ باد و دال سفندار بود از تقویم
چو در گذشت ز شب ہشت ساعتِ رصدی — براں قیاس کہ رائے منجم ست و حکیم
بجز و اصل رسید آفتاب نہ گردوں — بخانۂ نہمیں آفتاب ہفت اقلیم
خدایگانِ وزیراں کہ جز کمالِ خدائے — نیافت ہیچ شرف بر کمالِ او تقدیم
سپہرِ فتح ابو الفتح طاہر آں کہ شرف — ابد ز زادنِ امثالِ او شدہ ست عقیم

(کلیات انوری صفحہ ۳۴۳)

اس زمانہ میں سنجر کے دربار میں انوری کی رسائی ہو چکی تھی، کیونکہ یہ وہی زمانہ تھا جبکہ سنجر نے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۸۱) میں ۵۳۳ھ یقیناً غلط ہے، مسالک السالکین (جلد دوم صفحہ ۲۶) میں لکھا ہے کہ ہمدانی کو آگ میں بھی ڈالا تھا، ہمدانی کی ایک رباعی نزہۃ کے بیاض اشعار (صفحہ ۱۴۶) میں بھی ملتی ہے :-

در کوے مراد منزلے باید نیست — در گشتۂ عشق حاصلے باید نیست
گفتی کہ بصبر کار تو نیک شود — با صبر تو دانی کہ دلے باید نیست



اتسز خوارزم شاہ کو وہ تیر بھیجا تھا جس پر انوری کے اشعار لکھے ہوئے تھے، اسی ناصر الدین ابو الفتح طاہر[۱] نے قلعہ ہزار اسپ کو (۵۴۲ھ / ۱۱۴۷ء) فتح کرنے میں کوشش کی تھی، جس کے متعلق انوری صاف طور پر کہتا ہے :-

نصر فزاینده باد ناصرِ دیں را — صدرِ جہاں، خواجۂ زمان و زمیں را
صاحب ابو الفتح طاہر آں کہ ز رایش — صبحِ سعادت دمید دولت و دیں را
حصنِ ہزار اسپ اگرچہ بود در آں ملک — سدِ قدیم است حصنہائے حصیں را
کعبۂ دہلیز شد چو دید فصیلش — سجدہ کناں بر زمیں نہاد جبیں را
تیرِ سریعِ شہابِ کلکِ تو بس بود — رجمِ چناں صد ہزار دیو لعیں را
خود مددِ تیغِ بادشہ بچہ کار است — خاصہ تہیائے کار ہائے چنیں را
غیبتِ خوارزم شاہ کز پسِ شش ماہ — چشمۂ خوں کرد چشمِ حادثہ بیں را
دست بفتراکِ اصطناعِ تو در زد — معتصمِ ملک کرد حبلِ متیں را

(کلیات انوری صفحہ ۱۰)

یہ وزیر انوری کے علم اور قابلیت سے مرعوب معلوم ہوتا ہے، جیسا کہ اس شعر میں اشارہ پایا جاتا ہے :-

بن سوال و جواب امور دیواں را — تعلقے نبود کاں شعار و رسم شمات

(کلیات انوری صفحہ ۱۷)

اسی قصیدے کے بعض اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ انوری کا تعلق اس وزیر سے ایک عرصہ سے ہے، لیکن حاضری سے معذور ہے، چنانچہ کہتا ہے :-

[۱] راحت الصدور (ورق ۱۵۵ الف) سے معلوم ہوتا ہے، کہ چغری بیگ (المتوفی ۴۵۲ھ / ۱۰۶۰ء) کے زمانہ سے مرو سلجوقی دار الحکومت ہو گیا تھا، لیکن کلیات انوری (صفحہ ۶۵ - ۱۴۳) سے معلوم ہوتا ہے کہ ناصر الدین ابو الفتح نشاپور میں ہے اور وہی دار الحکومت بھی معلوم ہوتا ہے،

نہ صاحبا، ملکا زار روے خدمتِ تو دلم قرینِ عذاب ست و دیدہ جفتِ بکاست

دیک آمدم نیست ممکن از پے آں کہ رفتنم بسرین و نشستنم بقفاست

ہمی بہ پشت چو کشتی سفر نیارم کرد کہ راہِ وادی دشوار و عبرہ چوں دریاست

سرم بظلِ عنایت بپوشش بس باشد کہ سایہ ہاست کہ در تفِ آفتاب عناست

انوری کے کلام میں دو مجد الدین ہیں، ایک مجد الدین ابو طالب بن نعمہ جن کا صحیح نام مولانا محمد نے بھی لکھا تھا، کلیاتِ انوری (ص ۳۸۵) میں ہے:-

عالمِ مجد کہ بر بار خدایاں ملک ست مجد دیں اے بسزا بر ملکان بار خدا ے

میر بی طالب بن نعمہ کہ بے نعمت او آسمان تنگ و زمیں مفلس و خورشید گدا ے

اسی "نعمہ" کی رعایت اس رباعی میں ہے،

بو طالبِ نعمہ آنجہانی ہمہ مرد ہرگز غمِ ایں جہانِ خونخوار نخورد

ہر طالبِ نعمت کہ بدو روے آورد از نامِ پدر دامنِ حرصش پُر کرد

یہ ابو طالب، سید بھی تھے،

سید و صدرِ روزگار کہ ہست ز آلِ یاسیں چو از نبی صلعم یاسیں

میرِ بو طالب آں کہ مطلوبش نیست در ملکِ آسمان و زمیں

اور بلخ میں تھے:-

در بلخ چو پیری و جوانی بہم افتاد اسبابِ فراغت بہم افتاد جہاں را

بو طالبِ نعمہ چو شہابِ کی از جود یک چند کم آورد چہ دریا و چہ کاں را

سوگند نامے میں بھی مذکور ہیں:-

مجد دیں بو طالب آں عالم کرہ گم شد درو؟ عقلِ کل آں کردہ از بیرونِ عالم اطری



دوسرے مجد الدین کا نام ابو الحسن عمرانی تھا، اور وہ بلخ میں نہیں بلکہ رے میں تھے:-

چوں مرادِ خویش را با ملکِ رے کردم بیاں در خراساں تازہ بنہادم اقامت را اساس

تا خداوندے چو مجدِ دین و دولت بو الحسن حق شناسِ بندگان باشد چہ غم اورا سپاس

صفحہ ۳۸۹ میں بھی اسی "صاحبِ رے" کا حال ہے، جس کا مطلع یہ ہے:-

اے بدر گاہِ تو بر قصہ رساں صاحبِ رے رہ نشینِ سرِ کوے کرمت حاتمِ طے

صاحب و صدرِ جہانی و جہان تندہ بہ تست عقل داند کہ بجاں زندہ بود قالبِ حے

اس قصیدہ میں ایک نئی بات اور ملتی ہے:-

بخلافِ پدرت سر چو نیاورد فرود بوزارت کہ کند رائے ترا قانع کے

ان کا پورا نام مجد الدین ابو الحسن علی (ابن عمر) عمرانی معلوم ہوتا ہے، اور وہ وزیر بھی رہ چکے تھے،

دستورِ شہریارِ جہاں مجدِ دین کہ دین از جاہِ او بمنفعتِ جاوداں رسید

محسودِ جاوداں علی ابنِ عمر کہ عدل از رائے او بر دیتِ نوشیرواں رسید

یہ یقیناً وہی خوش قسمت بزرگ ہیں جن کی مدح سنائی (دیوان، ص ۲۶۹ بمبئی) نے بھی کی ہے، اور انوری کے ان اشعار کے ساتھ سید حسن غزنوی کے اشعار ٹکرا گئے ہیں، پہلے انوری کے اشعار سنئے،

دلم اے دوست تو داری دانی جاں ببر نیز اگر بتوانی

بدلے صحبتِ تو نیست گراں چہ حدیث ست بجاں ارزانی

نہ گرم بوسہ دہی جانِ منی کہ گرم جاں ببری ہم جانی

گاہم از عشوہ گری می خوانی گاہم از طیرہ گری می رانی

با فلک یار مشو در برِ من از پے ہر نکوئیے ارزانی

تا چو از حد ببری فاش کنم قصۂ دردِ بے درمانی

تا ترا از سرِ من باز کنند مجددین بوالحسن عمرانی (۱)

اب سید حسن غزنوی کے چند اشعار سنئے اور لطف اُٹھائیے:-

اے کہ تن را دل و دل را جانی از دل و جاں چہ نکوتر آنی

از تو دل در برِ من عاریتے بے تو جاں در تنِ من زندانی

گاہ در دل چو جہاں پیدائی گاہ در سینہ چو جاں پنہانی

عاشقِ زارِ توام مے بینی بندۂ خاصِ توام می دانی

قصۂ آتشِ دل من چہ کنم خود چو تو آب فرو می خوانی

زلفِ پُر فتنہ نشانی ہر دم فتنۂ زلف چرا نہ نشانی

بر دلِ من کہ تو داری مسکن ہر چہ از جور و جفا بتوانی

عذرِ من از تو نہ خواہد روزے مجددین بوالحسن عمرانی[1]

یہ مجد الدین ابوالحسن عمرانی کم از کم ۵۴۵ھ؁ تک یقیناً زندہ تھے، انوری کہتا ہے،

مجد دین بوالحسن کہ ہست عقیم ما در عالم از چو او فرزند

عدد سالہائے عمرش باد ہمچو تاریخ پانصد و چہل اند (کلیات ص ۹۵)

انوری کو اس ممدوح سے جلد فائدہ حاصل ہوا تھا، اور یہ مبالغہ حقیقت آمیز معلوم ہوتا ہے،

بندہ را در دو شہ مہ تربیتِ دولتِ تو کارہا شد ہمہ با رونق و ترتیب و نظام

گشت در مجلسِ ارکانِ جہاں از اعیاں تا کہ در خدمتِ درگاہِ تو ہست از خدام (ص ۲۲۴)

صفحہ ۱۹۲ پر بھی ہے:-

---

[1] مخطوطہ برٹش میوزیم ۱۲۱۸؁ ورق ۱۲۲؁، شعر العجم (حصہ اوّل) میں منوچہری کا بھی ایک قصیدہ اس ممدوح کے متعلق ہے جو بنا علی قلی ہدایت کے اڈیشن سے ماخوذ ہے، لیکن وہ قصیدہ یقیناً الحاقی ہے، کیونکہ منوچہری کے بہت بعد یہ ممدوح ہوا ہے،



تائید میں تابعین کے اقوال نقل کئے ہیں،

ابن جریر کی تفسیر کے نحوی پہلو کے متعلق یہ جان لینا ضروری ہے کہ جس وقت یہ تفسیر پوری ہوئی ہے بڑے بڑے علمائے نحو مثلاً ابو العباس احمد بن یحییٰ ثعلب، ابو العباس محمد بن یزید المبرد، ابو جعفر رستمی، ابو حسن ابن کیسان، ابو اسحاق الزجاج وغیرہ نے اس کو دیکھا، کسی نے اختلاف نہیں کیا، بلکہ ان میں سے ہر شخص نے اس کی تعریف و توصیف کی[1]،

**تفسیر ابن جریر اور فقہ** ابن جریر کی تفسیر کے وہ حصے بھی بہت اہم ہیں جہاں اُنھوں نے آیات سے مسائل فقیہہ کا استنباط کیا ہے، یہ خود مجتہد مستقل تھے، اور دوسرے مجتہدین کے مذاہب سے پوری طرح واقف تھے، اس لئے جو کچھ کہتے ہیں اس میں ایک خاص مجتہدانہ شان ہوتی ہے،

مثال کے طور پر ہم آیتِ وصیت کو پیش کرتے ہیں، سورۂ بقرہ میں ہے،

| | |
|---|---|
| كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ | تم پر فرض کیا جاتا ہے جب کسی کی موت نزدیک |
| الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا الْوَصِيَّةُ | معلوم ہونے لگے، بشرطیکہ کچھ مال بھی ترکہ میں |
| لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ | چھوڑا ہو تو والدین اور اقارب کے لئے معقول |
| بِالْمَعْرُوفِ حَقًّا عَلَى | طور پر کچھ نہ کچھ تبلا دیا جائے، جن کو خدا کا خوف |
| الْمُتَّقِينَ، | ہے، ان کے ذمہ یہ ضروری ہے |

اس آیت کا منشاء یہ ہے کہ مرنے والے پر، اگر اس کے پاس کچھ دولت ہو تو وصیت واجب ہے عام مفسرین کا خیال ہے کہ یہ آیت سورۂ نساء کی اس آیت سے منسوخ ہے جس میں وارثوں کے حقوق خود اللہ تبارک و تعالیٰ نے مقرر فرما دیئے ہیں، ابن جریر کو اس نسخ سے اختلاف ہے، وہ کہتے ہیں کہ نسخ تو اس حالت میں جائز ہوگا جب دونوں آیتوں میں جمع ممکن نہ ہو اور یہاں یہ صورت نہیں ہے، دونوں آیتوں

---

[1] معجم الادبا رج ۶ ص ۴۳۹،

ہیں اس طرح جمع ممکن ہے کہ آیتِ میراث کو عام وارثوں کے حق میں رکھا جائے، اور آیتِ وصیت کو ان ورثہ کے حق میں رکھا جائے جن کو قانوناً حقِ میراث نہیں پہنچتا ہے، لیکن وہ ضرورت مند ہیں،

ابن جریر کی اس رائے کو ہم حضرت الاستاذ علامہ سید سلیمان صاحب ندوی مدظلہ کی تقریر کے مطابق اس طرح بیان کر سکتے ہیں کہ آیاتِ میراث کا تعلق اُن مسلمانوں سے ہے جو ایک عائلی نظام رکھتے ہیں یعنی باپ، بیٹا، بھائی، بیوی، بہن الغرض تمام ورثہ مسلمان ہیں، اس صورت میں بیشک آیتِ میراث کے احکام جاری ہوں گے، لیکن اگر کسی مسلمان کے پاس نظام عائلی نہ ہو، مثلاً باپ مسلمان ہی، بیٹا مسلمان نہیں ہے یا بیٹا مسلمان ہے، باپ مسلمان نہیں ہی، اور یہ لوگ ضرورت مند بھی ہیں تو ان لوگوں کے لئے آیتِ وصیت کی رو سے ثلث مال میں وصیت کی جاسکتی ہی،

قطع نظر اس غیر عائلی نظام سے خود عائلی نظام میں کبھی ایسا ہوتا ہے کہ قریبی عزیز حقِ وراثت سے محروم ہو جاتے ہیں مثلاً محجوب لارث وغیرہ، شریعت نے ان کے لئے آیتِ وصیت کا نظام باقی رکھا ہی،

ابن جریر کو وجوبِ وصیت پر اس قدر اصرار ہے کہ فرماتے ہیں، کہ جس طرح قدرت کے باوجود روزہ کا چھوڑنے والا گنہگار ہوگا، اسی طرح قدرت کے باوجود وصیت سے غفلت کرنیوالا بھی عاصی ہوگا، [1]

**تفسیر ابن جریر اور علم کلام** مسائل فقہیہ کی طرح ابن جریر نے آیاتِ قرآن سے کلامی مسائل کا بھی استنباط کیا ہی جن کے پڑھنے کے بعد ابن جریر کی متکلمانہ حیثیت کا صحیح اندازہ ہوتا ہی،

ان کے بعض استنباطات تو اس قدر اہم ہیں کہ آج تک وہ مسلّم چلے آرہے ہیں، مثلاً حضرت سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی معراج جسمانی کے متعلق قرآن پاک سے اُنھوں نے جو دلیل قائم کی ہی، اسکو ایسا حسنِ قبول حاصل ہوا کہ ان کے بعد سے امام رازی تک عام اہلِ علم اس کو نقل کرتے چلے آتے ہیں،

وہ فرماتے ہیں کہ آیتِ اسرا میں قرآن نے "بعبدہٖ" کا لفظ استعمال کیا ہی،

---

[1] ابن جریر ج ۲ ص ۹۲،



| | |
|---|---|
| سُبْحَانَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصٰی، | وہ پاک ذات ہی جو اپنے بندہ (محمد) کو شب کے وقت مسجد حرام یعنی (مسجد کعبہ) سے مسجد اقصیٰ (یعنی بیت المقدس) تک لے گئی، |

اور عبد کا لفظ بول کر محض روح مراد لینا کسی طرح جائز نہیں، اس لئے یہ تسلیم کرنا ضروری ہی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج جسمانی ہوئی تھی، [1]

اس سلسلہ میں ابن جریر کی دقتِ نظر کے لئے ایک دوسری آیت پر غور فرمایئے،

سورۂ نساء میں ہے،

| | |
|---|---|
| اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِاٰیٰتِنَا سَوْفَ نُصْلِیْهِمْ نَارًا کُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَیْرَهَا لِیَذُوْقُوا الْعَذَابَ (نساء-۸) | بیشک جو لوگ ہماری آیات کے منکر ہوگئے ہم ان کو عنقریب ایک سخت آگ میں داخل کریں گے، جب ایک دفعہ ان کی کھال جل چکے گی تو ہم اسکی پہلی کھال کی جگہ فوراً دوسری کھال پیدا کر دیں گے تاکہ عذاب ہی چکھتے رہیں، |

ابن جریر اس آیت کے ماتحت ایک سوال قائم کرتے ہیں کہ اگر یہ جائز قرار دیا جائے کہ یہ دنیاوی جسم بدل دئے جائیں گے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ قیامت میں عذاب ان اجسام پر نہ ہوگا، جو دنیا میں کفر و معصیت کے مرتکب ہوئے تھے، بلکہ ان کے سوا دوسرے اجسام ہوں گے؟

ابن جریر نے اس کے مختلف جوابات نقل کئے ہیں، پھر اپنے مختار مسلک کو یوں بیان کیا ہے، کہ عذاب تو اصل میں انسان کو پہنچتا ہے نہ کہ گوشت و پوست کو، گوشت و پوست تو انسان کے عذاب کے لئے واسطہ اور ذریعہ ہیں، فی نفسہٖ لذت و الم میں ان کو دخل نہیں ہی، پس اگر ہر لحظہ

---

[1] ابن جریر ج ۱۵ ص ۱۳،

اللہ تبارک و تعالیٰ بے شمار اجسام دوزخ میں بدلتا رہے تو اس میں کوئی اشکال نہیں ہے، اس لئے کہ انسان تو بہر حال تکلیف اٹھا رہا ہے، اس تکلیف کے وسائط و ذرائع البتہ بدل رہے ہیں[۱]،

غور فرمائیے ابن جریر نہ صرف یہ کہ روحانی عذاب کے قائل اور اسی جسم پر عذاب کو منحصر جانتے ہیں، بلکہ اس آیت کے ماتحت ایک درمیانی مسلک نکالتے ہیں، کہ اصل عذاب روح پر ہے لیکن اس عذاب کے لئے جسمانی واسطہ ضروری ہے، اور اس جسمانی واسطہ کا تغیر و تبدل انسان کے درد و دکھ کے لئے کچھ مضر نہیں،

ان استنباطات کے سوا ابن جریر نے تفسیر میں فرقِ ضالہ کا رد بھی کیا ہے، چنانچہ قدریہ، جہمیہ، معتزلہ، رافضہ کی تردید جا بجا موجود ہے،

**دوسرے مباحث** مذکورۂ بالا اہم مباحث کے سوا اور قابلِ قدر چیزیں بھی اس تفسیری ذخیرہ میں موجود ہیں، مثلاً مفردات قرآن کی بحث، الفاظ کی لغوی تفسیر، ان کے مصادر، تثنیہ، جمع اور واحد کا ذکر، حضرات صحابہ و تابعین سے الفاظ کی جو تفسیر منقول تھی ان کا بیان، نیز کلامِ عرب کے بکثرت استشہادات، خود ابن جریر کا قابلِ رشک فصیح و بلیغ اندازِ بیان،

الغرض ابن جریر کی تفسیر کو محض روایات کا مجموعہ سمجھنا محض ناواقفیت ہے،

**تفسیر کا زمانۂ تصنیف، اسکی تلخیص، ترجے اور اس کی اشاعت** ابن جریر کی تفسیر کا زمانۂ تصنیف ۲۸۳ھ سے ۲۹۰ھ تک ہے[۲]، اس کو انھوں نے پہلے تیس ہزار صفحات میں لکھنا چاہا تھا، لیکن تلامذہ کی درخواست پر مختصر کر دیا، اور تین ہزار صفحات پر لکھا[۳]، خود تفسیر میں جا بجا کہتے ہیں کہ میں طوالت سے بچنے کے لئے اختصار سے کام لے رہا ہوں[۴]،

ابن ندیم کا بیان ہے کہ بعض لوگوں نے ان کی تفسیر کا اختصار بھی کیا ہے، ان میں سے ایک شخص ابو بکر بن الاخشید بھی ہیں[۵]،

---

[۱] ابن جریر ج ۵ ص ۸۵-۸۶ [۲] خطیب ج ۲ ص ۱۶۳ [۳] ایضاً ص ۱۶۳ [۴] تفسیر ابن جریر ج ۵ ص ۸۶ [۵] فہرست ابن ندیم ص ۳۲۶



نامِ من بندہ بہ یک ماہ بہر ہفت اقلیم
گشت مشہور صغار از تو و معروف کبار

یہ وزیر جیسا کہ مذکور ہوا ۵۴۸ھ تک یقیناً زندہ تھا لیکن شاید اسکے بعد وہ محبوس ہوا،

خلق را بے وجہ وزی عمر خواہد بود نے
وجہ روزی از کجا چون بوالحسن محبوس شد (ص ۱۹۶)

اور بعد میں قتل کر دیا گیا[۱]،

یازدہ سال فزون باشد تا کشتہ شدہ است
بوالحسن آن کہ ز احسانش سخن می رانی (ص ۱۹۷)

اس کے قتل سے انوری کو دلی صدمہ ہوا

ہیچ می دانی کہ در گیتی ز مرگ بوالحسن
چرخ جز قہر و ستم دیگر چہ دارد فائدہ (ص ۱۹۶)

یہ مجد الدین ابو الحسن عمرانی سید نہ تھے لیکن مجد الدین ابو طالب نعمہ کی سیادت اوپر ظاہر ہو چکی ہے، غالباً یہی سید تھے، جن کی وفات کسی سلخ رجب کو (بلخ میں) واقع ہوئی تھی، جس کے متعلق انوری کہتا ہے :-

شہر پُر فتنہ و پر شعلہ و پُر غوغا ست
سید و صدرِ جہان بار نہ داده ہمت کجا ست

اے ز اولادِ پیمبر وسطِ عقدِ مہر س
کز فراقِ تو بہ اولادِ پیمبر چہ عنا ست

بر وفاتِ تو جہان ماتمِ اولادِ رسول
تازہ تر کرد مگر سلخ رجب عاشوراست (ص ۵۵-۵۷)

بہت ممکن ہے کہ ان کا شمار راحت الصدور (ص ۱۸) والے ان "صدور جہان" میں ہو جن کو مذہب و سیاسی اقتدار بخشا تھا، کہ گور خاں خطائی (۵۳۶ھ / ۱۱۴۱ء) کو بھی اسکے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا پڑا تھا، یہ ابو طالب انوری کے سوگند نامے کی تالیف کے وقت تک یعنی ۵۵۵ھ کے قریب (جیسا کہ پہلے ثابت ہو چکا ہے) ضرور زندہ تھے، اس کے بعد اُن کا پتہ نہیں چلتا،

---

[۱] مجمل فصیحی (ورق ۱۵۷ الف) میں وزرائے سنجر کی فہرست میں کشتی تغیر کے ساتھ یہی نام ملتا ہے، جس کے ساتھ یہ جملہ بھی ہے: اور آخر بسعی و غمز جمعے بقتل رسانیدند، اسلئے انوری کا یہ قول صحیح ہے کہ وہ وزیر بھی تھے اور آخر میں قتل ہوئے،

انوری کا ایک ممدوح مودود شاہ (مؤید الدین) ہے، جس نے سنجر کے بعد وفات پائی، ممدوح ہے:

جہاں ز رفتنِ مودود شہ مؤید دیں
بماند و مزاج و بماند و سرشت

چہ دفریست جہاں لا الٰہ الا اللہ
کہ روزگار در و جز قضائے بد ننوشت

چہ سود از آں کہ ازیں پیش خسرواں کردند
ز رزم گاہِ قیامت بہ بزم گاہِ بہشت

چو عاقبت ہمہ را تا بہ سنجر اندر مرد
شدہ ست بسترِ خاک و شدہ ست بالین خشت

کدام جاں کہ قضاش از برائے چرخ نبرد
کدام تن کہ فناش از فرود خاک نہشت

اور آخری شعر میں اس کے باپ ناصر الدین کی طرف اشارہ ہے:-

خدائے ناصر دیں را بزرگ اجرے داد
کہ دہر خورد بساطے ز ملک در ننوشت

اسی مودود شاہ بن ناصر الدین کا لقب "مؤید الدین" بعد میں ہوا ہے، انوری نے اس وقت لکھا ہے:-

حاسدا مودود شاہِ ناصر الدین الّقب
اگر مؤید شد تو زیں معنی چرا باشی بدرد

چوں پدر مودود نامش کرد تائیدِ خدائے
از سیم حرف و چہارم حرفِ او یک حرف کرد

(ص ۲۴۲)

یہ مودود شاہ "مؤید" غالباً "ملک مؤید" ہے جو سنجر کے خاص غلاموں میں تھا اور جو سنجر کی وفات کے بعد محمود خاں بغراخانی پر غالب آگیا تھا، یہ غالباً قطب الدین مودود شاہ بن عماد الدین "زنگی (والی موصل و مضافات) سے مختلف ہے، موخر الذکر کی مدح ص ۱۳۱ سے اس طرح شروع ہوتی ہے:-

خوشا نواحیِ بغداد جائے فضل و ہنر
کہ کس نشاں نہ دہد در جہاں چنیں کشور

انوری اس کے پاس پہنچا ہے،

بریں نوید رسیدم دریں دیار و زمن
بگوشِ حضرتِ شاہِ جہاں رسید خبر

مرا بحضرتِ عالی تقربے فرمود
برائے شاہ بپرداختم یکے دفتر

---

سلہ روضۃ الصفا، جلد چہارم ص ۱۲۰ (۱۹۱۵ء)



بہر دو ماہ بسازم ز علم تصنیفے
برائے دولتِ منصور خسرو صفدر

لیکن وہاں مایوسی رہتی ہے:-

ولیک شاہ بفتحِ بلاد مشغول است
نمی کند بپرستندگانِ خویش نظر

مودود نام کا ایک اور ممدوح ہے، یعنی ضیاء الدین مودود احمد عصمی، یہ مجد الدین ابو الحسن عمرانی کا ہمعصر تھا، جو تقریباً ۵۴۰ھ (۱۱۴۵ء) میں ضرور برسر اقتدار تھا اس کا ہمعصر ہونا ان اشعار سے ثابت ہے:-

با آں کہ چند سال بدیدم بتجربت
کز کلِ خواجگانِ جہاں بوالحسن بہست

پنداشتم کہ بازوئے احساں قوی تراست
آنجا کہ بر کتف علم برہن بہ است

مودود احمدِ عصمی عشوہ ایم داد
گفتم کہ او سر است، سر آخر ز تن بہ است

راغب شدم بخدمتِ او تا شدم چنانک
حالِ سگانِ بوالحسن از حالِ من بہ است

(ص ۳۲۴)

اور یہ مودود دراصل "نائبِ دستور" تھا:

گفتا کہ کلکِ نائبِ دستورِ بحر و بر
آں لطف گاہ بر و سیاست برو زبار

مودود احمد عصمی کز مکانِ اوست
بنیاد دیں و قاعدۂ دولت استوار

(ص ۱۹۶)

اسی لئے اس کو "صدرِ آلِ نظام" یعنی ناصر الدین ابو الفتح طاہر بن فخر الملک بن نظام الملک کا "ثانی اثنین" (نائب) کہا ہے،

مملکت را بکلک داد نظام
ثانی اثنینِ صدرِ آلِ نظام

ہمچنیں جاوداں ز کلکش باد
ملکِ گیتی برونق و بہ نظام

صدرِ دنیا ضیاءِ دینِ خدا
سدِ دولت مؤید الاسلام

میر مودود احمدِ عصمی،
آں بہ از جنبش و بہ ارام

(ص ۲۳۶)

اس ضیاء الدین مؤید الاسلام مودود احمد عصمی کی مدح میں حبیب گنج کے مخطوطہ

سے عبد الواسع جبلی کے بھی کچھ اشعار ملاحظہ فرمائیے،

اے بزرگے کہ ذوالجلال بجود — از عدم تاورد بجہ او موجود
صدرِ کافی مؤید اسلام — بُلمعالی ضیاء دیں مودود

لیکن جبلی کے ذیل کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ضیاء الدین مودود غزنیں میں بھی رہ چکے ہیں :-

سپاس ایزد کہ آمد بشارت غزنیں — بصحتِ تنِ صدر اجل ضیاء الدیں
ابوالمعالی مودود احمدِ عصمی — کہ وقتِ خشم چو ناراست گاہ حلم چو طیں
مویدے کہ زخلق و زقدر او گویند — شرف بسپہر اثیر و لطف بہشت بریں

ان کے علاوہ انوری کے اور بھی ممدوح ہیں جن کا حال تحقیق طلب ہے،

---

## شعر العجم حصہ اوّل

فارسی کی شاعری کی تاریخ جس میں شاعری کی ابتدا، عہد بعہد کی ترقی اور اُن کے خصوصیات و اسباب سے مفصل بحث کی گئی ہے، اور اسی کے ساتھ تمام مشہور شعراء (عباس مروزی سے نظامی تک) کے تذکرے اور اُن کے کلام پر تنقید و تبصرہ ہی، قیمت :- عہ

## ایضاً حصہ دوم

شعرائے متوسطین کا تذکرہ (خواجہ فریدالدین عطار سے حافظ اور ابن یمین تک) مع تنقید کلام، قیمت :- عہ

"منیجر"



# اُردو صحافت کا ارتقاء

از جناب سید ابو عاصم صاحب ایم اے علیگ

۱۴۹۸ء میں واسکوڈی گاما نے ہندوستان کیا دریافت کیا کہ اس سونے کی چڑیا پر اہلِ یورپ کی حریصانہ نظریں پڑنے لگیں، کہیں اقتصادی اور معاشی سدھار کے لئے تجارتی تعلقات کے ریشمی پھندے ڈالے گئے، کہیں روحانی اصلاح کے لئے مشنریوں کا جال بچھایا گیا، اس کارِ خیر میں یورپ کا ہر ملک ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانا چاہتا تھا، اور یہ کشمکش اتنی بڑھی کہ جنگوں کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا،

آخر کار برطانیہ اپنی فطری صلاحیت کی وجہ سے دوسری قوموں پر غالب رہی اور ہندوستان کو تہذیب و شائستگی کا سبق پڑھانے لگی اور اُس کے مذہبی اداروں نے چھاپے کی بنیاد ڈالی، اور اب یہ بلا خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان میں برٹش پریس کی بانیِ اوّل مشنریں تھیں[1] مشنریوں کا سب سے پہلا قدم مدراس میں آیا، اس لئے یہ بعید از قیاس نہیں ہے کہ پہلا تامل ٹائپ ۱۶۷۸ء میں جاری ہوا، اور دوسری کوشش ۱۷۱۲ء میں ٹرانکوبار مشین کے لئے ہوئی، پھر ۱۷۶۱ء میں حکومت مدراس نے دیبری پانڈیچری مشین کو پریس کے استعمال کی اجازت دی،[3] بنگال میں یوں تو انگریز اورنگزیب کی اجازت سے بہت پہلے فورٹ ولیم تعمیر کر چکے تھے، لیکن ابھی ان کے قدم جمے نہیں تھے، اور نگ زیب کے انتقال کے بعد ۱۷۱۴ء میں اُنھوں نے فرخ سیر

---

[1] Rise of Christian power. by Basu. [2] Newspaper - - History Times. Page 118. [3] Encyclo Pedia of India - - Vol III P. 688.

سے گجرات، دکن اور بنگال میں بلا محصول تجارت کرنے کی اجازت حاصل کرلی، ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ کے حملے نے سلطنت مغلیہ کو ہلا دیا، اسکی مرکزیت ختم ہونے لگی، اور اس کے صوبے آزاد اور خود مختار ہونے لگے، اُس وقت بنگال میں علی وردی خاں نواب بن بیٹھا، مرہٹے الگ اپنی طاقت بڑھا رہے تھے، اودھ کا تعلق دلی سے برائے نام رہ گیا تھا، ادھر سکھ بھی ہاتھ پاؤں نکال رہے تھے، بنگال میں علی وردی خاں کے انتقال کے بعد ۱۷۵۶ء میں سراج الدولہ تخت پر بیٹھا، اسکی اور انگریزوں کی نہ بنی، کیونکہ وہ اب تجارت سے ملک گیری کا خواب دیکھنے لگے اور پھر سازشوں کا ایک جال بچھ گیا اور جنگِ پلاسی ۱۷۵۷ء میں بنگال اور جنگِ بکسر ۱۷۶۵ء میں دہلی اور اودھ کمپنی کے زیر اثر آ گئے، اور اس کو بنگال، بہار اور اڑیسہ کی دیوانی مل گئی، گویا بنگال برطانوی علاقہ ہو گیا، اس کے بعد وہاں ایسی لوٹ مچی کہ وہاں کے تمدن و معاشرت اور صنعت و حرفت کو شدید نقصان پہنچا، اس ظلم و ستم کی داستان اتنی عام ہو چکی تھی کہ جب کلایو نے خودکشی کی تو ڈاکٹر جانسن نے اس کے متعلق کہا کہ "جس شخص نے اپنی قسمت ایسے جرائم سے بنائی تھی، اسکے ضمیر نے اُسے خودکشی پر مجبور کر دیا" اگر اس وقت کی دلی کی تباہی کا نقشہ دیکھنا ہو تو سودا کا "شہر آشوب" دیکھ لیجئے،

۱۷۷۲ء تک کمپنی نے مدراس، بمبئی اور بنگال کی ریذیڈنسی قائم کرلی، اور جنوبی ہند میں بہت بڑے علاقہ پر قبضہ کرلیا، گویا کل کے تاجر اب تاجدار بن بیٹھے، انگلستان کی پارلیمنٹ نے ۱۷۷۳ء میں "ریگولیٹنگ ایکٹ" پاس کیا، اس سے کمپنی پارلیمنٹ کے ماتحت ہو گئی، اور تین ریذیڈنسیاں ایک نظام میں آگئیں، جس پر ایک گورنر جنرل مقرر کیا گیا، اور چار ممبر کونسل، بنگال دار السلطنت اور ہسٹنگز پہلا گورنر جنرل بنا، اس زمانہ سے انگلستان اور ہندوستان کے تمدنی اور معاشرتی تعلقات اور مضبوط ہوئے، اس سے پہلے جو انگریز آتے تھے وہ ذہنی، اخلاقی اور معاشرتی حیثیت سے نہایت پست ہوتے تھے، اس دور سے کچھ انسان بھی آنے لگے، آربن ولکن ۱۷۶۵ء میں ہندستانی



اردو فارسی اور بنگالی ٹائپ کا بانیِ اول تھا[1] یہ پریس اٹھارہویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی کے شروع میں رائج ہوا، یہ بات قابلِ غور ہے کہ ٹائپ لیتھوگرافی کے قبل وجود میں آیا، اس ٹائپ کا استعمال نہ صرف فورٹ ولیم کے سرکاری کاغذات کے لئے ہوتا تھا، بلکہ مولانا سید احمد بریلوی شہید اور مولوی کرامت علی صاحب جونپوری نے اپنی اصلاحی تحریک ۲۷-۱۸۲۶ء کی اشاعت کے لئے بھی اسی سے فائدہ اٹھایا، جب کلکتہ میں پورا استحکام ہو گیا تو سب سے پہلے جیمس آگسٹس ہکی (James Augustus Hicky) نے ۲۹ جنوری ۱۷۸۰ء میں بنگال گزٹ نکالا، یہی ہندوستان کا پہلا اخبار کہا جا سکتا ہے، یہ ہسٹنگز پر خوب حملہ کرتا تھا، اس لئے زیادہ دن زندہ نہ رہ سکا، ۱۷۸۰ء سے ۱۸۱۸ء تک ہندوستانی اخباروں پر جو زیادہ تر انگریزی تھے، بہت سی پابندیاں عائد کر دی گئی تھیں، عبد الرزاق صاحب نے پنڈت کیفی پر اعتراضات کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "سب سے پہلا اخبار ۱۸۱۸ء میں شائع ہونا بتایا گیا ہے یہ صحیح نہیں ہے، گورنمنٹ ہند نے فتحِ دلّی کے بعد یہ ضروری سمجھا تھا کہ سرکاری کاروبار کی اطلاع اہلِ ہند کو دی جانی چاہیے، یہ ضرورت اس لئے پیش آئی تھی کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے افسروں پر اخبارات سختی کے ساتھ نکتہ چینی کرتے تھے اور وہ اُن کو بعض اوقات جلا وطن کر دیتی تھی، اس لئے اوّل اوّل بعض حکام کی سرکاری تحریرات کے ذریعہ اطلاعیں دی گئیں، بالآخر ۱۷۸۴ء میں انڈین گزٹ جاری کیا گیا، اس کی اشاعت ہفتہ وار ہوتی تھی، ملاحظہ ہو "دی بنگال اینول ۱۸۵۳ء" "انڈین ڈیلی میل ۱۸۳۱ء"[2] معلوم نہیں فتحِ دہلی سے کون فتح مراد ہے، میرا خیال ہے کہ موصوف کو غلط فہمی ہوئی، اس کی مزید تشریح کی ضرورت تھی، اٹھارہویں صدی کے آخر میں انگریزی کے بہت سے اخبار نکلنے لگے تھے، مثلاً کلکتہ گزٹ، اور نٹیل ایڈورٹائزر، لیکن ۱۷۸۰ء کے قبل کسی اخبار کا وجود ثابت نہیں ہے[3]

---

۱؎ Cultural History of India ۲؎ رسالہ اردو ۱۹۳۵ء

۳؎ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا،

انڈین گزٹ ضرور ایک اخبار تھا، جو بعد میں شائع ہوا،

۱۲۱۵ھ (۱۸۰۰ء) میں فورٹ ولیم کالج میں پریس کھل گیا، اور یہاں سے ڈاکٹر گلکرسٹ اور کالج کے منشیوں کی تصانیف شائع ہونے لگیں، اسی زمانہ میں سرام پور کے پادریوں نے بھی ایک مطبع کھولا، جس میں مختلف ہندوستانی زبانوں میں کتابیں چھپتی تھیں، یہ وہ وقت تھا جب ولزلی گورنر جنرل تھا، اور ابھی تک ہندو مسلم تعلقات بہت خوشگوار تھے، ان کے لباس اور طرز معاشرت میں بڑی حد تک یکسانیت تھی، سراج الدولہ اور مہاراجہ نیب کشن کا لباس ملائیے تو کوئی فرق نظر نہ آئیگا، تعلیمیافتہ لوگوں کی زبان فارسی تھی جس کو ہندو و مسلمان دونوں سیکھتے تھے، اسی لئے جب شاہ عالم نے کلایو کو بنگال کی دیوانی عطا کی تو یہ شرط بھی رکھی تھی کہ سرکاری زبان فارسی رہے گی، اس کا اثر یہ ہوا کہ جتنے اخبارات نکلے سب فارسی زبان میں، سب سے قدیم فارسی اخبار جام جہاں نما ہے، جو غالباً مئی ۱۲۳۷ھ (۱۸۲۲ء) میں کلکتہ سے نکلا تھا، سرام پور سے ایک بنگالی اخبار سماچار درپن ۱۲۳۳ھ (۱۸۱۸ء) میں پہلے ہی نکل چکا تھا، فارسی کا یہ پہلا اخبار تھا ۱۲۳۸ھ (۱۸۲۳ء) میں ایک اردو ضمیمہ بھی شائع کرنے لگا تھا، لیکن یہ ضمیمہ مقبول نہ ہو سکا، اس کے بعد بہت سے فارسی اخبارات جاری ہوئے، آئینہ سکندر ۱۲۴۶ھ (۱۸۳۱ء)، سلطان الاخبار ۱۲۵۰ھ (۱۸۳۵ء) میں، اس کے اڈیٹر اردو کے مشہور انشاپرداز رجب علی سرور تھے، سراج الاخبار ۱۲۵۷ھ (۱۸۴۱ء) یہ مغل دربار کا کورٹ گزٹ تھا، اور بہادر شاہ کے زیر سرپرستی دلی سے نکلتا تھا، اور بھی بہت سے اخبار نکلے جن کی تفصیل غیر ضروری ہے،

۱۲۱۸ھ (۱۸۰۳ء) ہندوستان کی تاریخ میں بہت اہم ہے، کیونکہ اسی سال لارڈ لیک نے دلی پر قبضہ کر لیا، اور مرہٹوں کا اقتدار ہمیشہ کے لئے ختم ہوگیا، شاہ عالم مرہٹوں کے بجائے انگریزوں کے

---

۱؎ انسائیکلو پیڈیا آف انڈیا، نیوز پیپر ہسٹری، ٹائمس لندن، ہسٹوریکل جرنل میں ایک مضمون بہ عنوان [illegible] وغیرہ کی تحقیق یہی ہے کہ بنگال گزٹ پہلا اخبار ہے،



ہاتھوں کٹھ پتلی بن گیا، گویا سلطنت مغلیہ کی راجدھانی بھی بدیسی ہاتھوں میں چلی گئی اور قدیم و پر عظمت ہندوستانی معاشرت کے مرکز میں بھی گھن لگ گیا، گو شاہ عالم ۱۲۲۱ھ (۱۸۰۶ء) تک زندہ رہا، اور اکبر ثانی ۱۲۲۱ھ–۱۲۵۳ھ (۱۸۰۶–۳۷ء) اور بہادر شاہ ۱۲۷۴ھ (۱۸۳۷–۵۷ء) تک بادشاہ کہلائے، لیکن ان کی حقیقت شاہ شطرنج سے زیادہ نہ تھی، اس وقت سے عجیب ذہنی کشمکش شروع ہوئی، نئی تہذیب و تعلیم پرانی معاشرت و تعلیم سے دست و گریبان نظر آنے لگی، اس کشمکش کا ہلکا سا عکس مولوی نذیر احمد صاحب کی کتاب ابن الوقت میں نظر آتا ہے، سیاسی اقتدار کے بعد (۱۸۰۵–۱۸ء) سے اقتصادی، تعلیمی اور ادبی ترقی کا دور شروع ہوا، تعلیمی دلچسپی کچھ بڑھ گئی، جدید تعلیم کی بنیاد رکھی جانے لگی، اور بہت سی معاشرتی تحریکیں اس تعلیم کا نتیجہ تھیں شروع ہو گئیں، اس زمانہ میں بنگال کی خاص اہمیت ہو گئی تھی، اور وہاں کا متوسط طبقہ ترقی کر رہا تھا، اس ترقی نے دوسروں کو بھی ترغیب دی، فورٹ ولیم کالج کی وجہ سے دیسی زبان پھیل رہی تھی ۱۲۳۲ھ (۱۸۱۷ء) میں ہندو کالج قائم ہوا اور راجہ رام موہن رائے نے قدیم سنسکرت تعلیم کے خلاف آواز بلند کی، اس وقت سے سارے ہندوستان میں ایک تعلیمی اور مذہبی کشمکش شروع ہو گئی ۱۲۵۰ھ (۱۸۳۵ء) میں مکالے کی تجویز پر انگریزی کو ذریعۂ تعلیم تسلیم کر لیا گیا، ہمارے پرانے قانون بھی اپنی اصلی حالت پر نہ رہے، بلکہ وہ ہندو لا، مسلم لا کے بجائے اینگلو ہندو لا اور اینگلو مسلم لا ہو گئے، مغرب اور اس کے فلسفیانہ خیالات نے بھی ایک ہل چل مچادی، اسی زمانہ میں مولانا سید احمد بریلوی نے تجدید و اصلاح اور سکھوں کے خلاف جہاد کا علم بلند کیا، مولینا کرامت علی جونپوری کی تحریک مشرقی بنگال میں اردو کے ذریعہ اپنا کام کر رہی تھی، ان تحریکوں نے اردو کو ترقی دی، لیکن اردو ٹائپ مقبول نہ ہو سکا، اور دلی میں ۱۲۴۸ھ (۱۸۳۳ء) میں لیتھو پریس قائم ہوا، ۱۲۵۰ھ (۱۸۳۵ء) میں شمالی ہند میں دفتر کی زبان فارسی سے اردو ہوئی، اور پریس کو بھی آزادی ملی ۱۲۵۲ھ (۱۸۳۶ء) میں مولوی محمد حسین آزاد کے والد مولوی باقر نے دہلی سے اردو اخبار نکالا۱؎، اردو صحافت میں اولیت

کا فخر اسی کو حاصل ہے، یہ ۱۸۵۸ء تک خوب چلتا رہا؛ علمی نقطۂ نگاہ سے اردو اخبار اور اسکے مطبع کو اشاعتِ خیالات، تربیتِ رائے عامہ، طباعتِ کتب میں اولیت کا امتیاز حاصل ہے؛[1] اس میں ادبی حیثیت کو زیادہ اہمیت تھی، چنانچہ ذوق، مومن اور غالب کی غزلیں کبھی ہم طرح غزلیں، کبھی زبان و محاورات کی بحث کبھی شہیدی کی شاعری پر مباحثہ وغیرہ موضوعوں پر مضامین ہوتے تھے، ۱۸۴۳ء میں مولوی باقر علی نے اردو کا ایک دوسرا اخبار مظہر حق نکالا، معلوم نہیں وہ کتنی مدت تک زندہ رہا،

دوسرا اخبار سید الاخبار ہے جس کو سر سید احمد خاں کے بھائی سید محمد خاں نے ۱۸۳۷ء میں نکالا تھا، موصوف کا عین شباب میں انتقال ہوگیا، کچھ دنوں تک سر سید نے بھی اس کو چلایا، مولانا حالی حیاتِ جاوید میں لکھتے ہیں :-

"سید الاخبار کا اہتمام اگرچہ برائے نام ایک اور شخص کے سپرد تھا، مگر زیادہ تر سر سید خود اس میں مضامین لکھا کرتے تھے، لیکن یہ اخبار ایک مدت تک جاری رہکر بند ہوگیا"

"فوائد الناظرین"، ماسٹر رام چند دلی سے نکالا کرتے تھے، پہلے یہ ماہوار رسالہ تھا لیکن ۱۸۴۷ء سے ہفتہ وار ہوگیا، اس اخبار میں مشہور اشخاص کی تصویریں اور مختلف مقامات کے نقشے بھی ہوتے تھے، یہ چیز پہلے کہیں نظر نہ آتی تھی، نقشے، سائنٹفک مضامین، علمی آلات اور تاریخی اشخاص کی دستی تصویریں اسکی خصوصیات میں سے تھیں، ۱۸۴۵ء میں ایک اور اخبار قران السعدین پنڈت دھرم نرائن بھاسکر کی ادارت میں دلی سے نکلا، یہ بارہ برس تک زندہ رہا، ۱۸۴۷ء میں قمر الدین نے بھلٹی بازار آگرہ سے ہفتہ وار اخبار "اسعد الاخبار" نکالا، دیوان تفتہ کا پہلا حصہ اسی اخبار کے مطبع سے ۱۸۴۹ء

---

[1] آب حیات محمد حسین آزاد ۵۰۔۱۰۰ اسے آدھی صدی پہلے کے اردو اخبارات، کیفی رسالہ اردو ۱۹۳۵ء،

[2] یہ ایک فارسی اخبار تھا،



میں شائع ہوا، اس میں قطعۂ تاریخ اور کتابوں کا اشتہار نظم میں درج ہوتا تھا، ۲۰ نومبر کی اشاعت میں مرزا حاتم علی مہر کا وہ قطعہ جو انھوں نے لارڈ ڈلہوزی کے خیر مقدم میں کہا تھا درج ہے، ؎

| | |
|---|---|
| ڈلہوزی است رونق بخشِ ہند | اے صبا در تہنیت ایں مژدہ گو |
| مصرعۂ تاریخِ مقدم گفت مہر | افتخارِ ہند باد انجم تو |

۱۵ جولائی ۱۸۵۱ء کے نمبر میں یہ خبر درج ہے کہ بدر الدین علی خاں نے ملکہ وکٹوریہ اور پرنس البرٹ کے لئے مہریں کھود کر دیں،

احسن الاخبار مطبوعہ ۲۲ اکتوبر ۱۸۴۸ء میں لکھتا ہے کہ "صادق الاخبار کے اڈیٹر صاحب نے رفتہ رفتہ اپنے اخبار کو اردو زبان کا اخبار بنا دیا ہے، سمجھ میں نہیں آتا کہ فارسی زبان سے کیوں رابطۂ الفت منقطع کر دیا، شاید اخبار کے خریداروں نے تقاضا کیا ہوگا کہ فارسی زبان ترک کرو اور اردو زبان جاری کر دو" اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اردو زبان کا مطالبہ روز بروز بڑھ رہا تھا، بادشاہ دہلی کے مقدمہ کے سلسلہ میں، اس کے بعض حالات پر روشنی پڑتی ہے،" ایک گواہ کشن سنگھ نامی کا بیان ہے کہ

"جمال الدین ایک ہفتہ وار اخبار نکالتا تھا، جس کے مضامین قطعی انگریزی حکومت کے خلاف ہوتے تھے، اس کا نام "صادق الاخبار" سچی خبریں تھا، دلی میں بڑا اخبار سمجھا جاتا تھا"

کریم الدین مصنف تذکرۂ شعرار نے مطبع رفاہ عام قائم کیا، اور ایک اخبار "کریم الاخبار" کے نام سے جاری کیا، ۱۸۴۹ء میں شیخ محمد ضیار اللہ نے ضیار الاخبار نکالا، یہ وہ وقت تھا جب ڈلہوزی ہندوستان کا گورنر تھا، جو مغربی تہذیب کی برتری کے

خبط میں مبتلا تھا، اس نے دیسی ریاستوں کے الحاق کا ایک طوفان بپا کر رکھا تھا، لیکن اسی کے ساتھ اسکے عہد میں سائنس کے فیوض و برکات بھی نظر آنے لگے، ٹیلیگراف، جہاز رانی اور ڈاک میں سہولتیں ہوتی گئیں، کارڈ کی قیمت ایک پیسہ اور لفافہ کی دو پیسہ تھی، انگریزی تعلیم اور سرکاری ملازمتوں کی وجہ سے اردو تحریر کے تکلفات ختم ہونے لگے اور ایک کاروباری زبان پیدا ہونے لگی، جس نے اسکو پھیلنے میں بڑی مدد دی[1]، ۱۸۳۵ء سے لیکر ۱۸۵۷ء تک کا زمانہ اخباروں کی انتہائی آزادی کا زمانہ تھا، یہی وجہ ہے کہ اس زمانہ میں اردو اخبارات بڑی تیزی سے بڑھنے لگے اور ایشیاٹک جرنل کی زبان میں "انگریزی نہیں بلکہ دیسی اخباروں نے ہندوستان میں معاشرتی، اخلاقی، مذہبی تعلیم اور مادی انقلاب پیدا کیا ہے"، دیسی اخبارات اپنے حقوق کے لئے لڑتے رہے اور یہ مطالبہ کرتے رہے کہ ہندوستانیوں کو اعلیٰ عہدوں پر فائز کیا جائے[2]، واقعہ یہ ہے کہ قوم کی بیداری میں ان اخباروں کا بہت بڑا حصہ ہے، اسی وقت سے اردو صحافت نے اپنے ہونہار ہونے کا پورا ثبوت دیدیا تھا، یہ اخبارات اس وقت کی معاشرت اور مذاق کے آئینہ دار ہیں،

کوہ نور کے اجراء سے اردو صحافت نے ترقی کی راہ میں ایک قدم اور آگے بڑھایا، یہ نہ صرف پنجاب بلکہ ہندوستان کا اپنی طرز کا پہلا اخبار تھا، جسے ۱۸۵۰ء میں منشی ہرسکھ رائے نے لاہور سے نکالا، منشی ہرسکھ رائے مضافاتِ سکندرہ کے رہنے والے تھے، مولانا احسن مارہروی نے اسکا سنہ اجراء ۱۸۴۹ء بتلایا ہے[3]، یہ وہ وقت تھا جب ہندوستان میں بڑی کثرت سے اردو اخبارات نکلتے تھے، دتاسی کے بیان کے مطابق پچیس اخبارات اور رسائل صرف صوبہ شمالی و مغربی سے نکلتے تھے، جن میں تئیس ہندوستانی زبان کے تھے، دو فارسی کے اور ایک بنگالی کا،

[1] کیمبرج ہسٹری آف انڈیا [2] Press after Mutiny Historical Journal
[3] تاریخ نثر اردو،



دوسرے صوبوں کے اخبارات کو ملا کر پچاس تک تعداد پہنچ جائیگی، ۱۸۵۰ء کے آخر ہی میں کوہ نور کے خریداروں کی تعداد ۲۵۰ تک پہنچ گئی تھی، اس کے خریداروں میں سر جان لارنس لفٹننٹ ایس، مسٹر میکلوڈ، مسٹر سیلمن، مسٹر میگریگر اور دوسرے انگریزوں کے نام بھی ملتے ہیں، یہ مدراس، بمبئی اور کلکتہ تک پھیلا ہوا تھا، ۱۸۸۳ء میں یہ اخبار ہفتہ وار سے روزانہ ہوگیا، لیکن پھر ہفتہ وار ہوگیا، یہ وہی اخبار ہے، جس کے عملہ میں منشی نولکشور بھی کام کرتے تھے، اس کے دامن سے اس دور کے بہت سے ہندو اور مسلمان ادیب اور اہل قلم وابستہ رہے، مثلاً نادر علی، تاج الدین، منشی نول کشور، مرزا موحد، منشی نثار علی شہرت، مولوی سیف الحق ادیب، مولوی محمد دین فوق اور منشی محرم علی چشتی وغیرہ اس کے اڈیٹر رہے، بعض عیسائی بھی اس کے اڈیٹر تھے، اس کا نام اتنا مقبول ہوا کہ ہندوستان کے بہت سے اخباروں نے اپنے نام میں نور کا جزء لگایا، مثلاً دریائے نور لاہور، نور الاخبار اور افشاں لدھیانہ، نور الانوار و مطلعِ نور، ۱۹۱۴ء میں یہ نامی گرامی اخبار بند ہوگیا،

اس زمانہ کے اکثر اخبار اردو اور ہندی دونوں میں شائع ہوتے تھے، اور بعض اخباروں میں انگریزی اور اردو ساتھ ساتھ ہوتی تھی، مثلاً آگرہ گورنمنٹ گزٹ یہ سرکاری اخبار تھا، جو انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں نکلتا تھا، اندور سے آٹھ صفحوں کا ہفتہ وار اخبار مالوہ نکلتا تھا، اس کے ایک کالم میں ہندی اور دوسرے میں ہندوستانی ہوتی تھی، اس کے اڈیٹر دھرم نرائن بہت اچھے شاعر تھے، انھوں نے مل کی پولیٹیکل اکانومی اور انگلستان کی تاریخ کا ترجمہ بھی کیا ہے، راجہ بھرت پور کی سرپرستی میں بھرت پور صوبہ آگرہ سے ایک اخبار مظہر السرور نکلتا تھا، اس میں بھی ہندی اردو دونوں ہوتی تھی،

بنارس سے ۱۸۵۰ء میں ہرکارہ جاری ہوا، بریلی سے عمدۃ الاخبار، لکشمن پرکاش کی

ادارت میں نکلا، اُنھوں نے ایک علمی اخلاقی انسائیکلوپیڈیا بھی لکھی جس کا نام مشرقی طرز پر زینت رکھا، مرزاپور سے امریکی پروٹسٹنٹ مشنریوں کا اخبار خیر خواہ جاری ہوا، [illegible] سے شیخ عبداللہ نے شملہ اخبار نکالا، موصوف انگریزی اور ہندوستانی دونوں سے واقف تھے، ۱۸۵۳ء میں دیوان چند رئیس سیالکوٹ نے ہمائے بے بہا کے نام سے مطبع چشمۂ فیض سے جاری کیا، اخبار وکٹوریہ پیپر کے نام سے بہت دنوں تک زندہ رہا، کلکتہ سے اردو گائڈ نکلا، مولانا احسن مارہروی نے خورشید عالم سیالکوٹ اور طلسم لکھنؤ کا بھی ذکر کیا ہے، یہ دونوں اخبار ۱۸۵۶ء میں جاری ہوئے تھے، اس میں طلسم لکھنؤ اس لئے اہم ہے کہ اس سے ۱۸۵۷ء کی شورش کا کچھ حال معلوم ہوتا ہے، لیکن اس کی خبریں زیادہ تر افواہیں ہوتی تھیں، اسی کے بعد پہلا دور ختم ہو جاتا ہے،

اس دور میں سیاسی اور خارجی امور اخباروں کی توجہ کا مرکز تھے، پریس کی آزادی کی وجہ سے لب ولہجہ میں بہت کچھ بے باکی تھی، خالص اشتہار کا اب تک رواج نہیں ہوا تھا، اخباروں کی زبان گو باغ وبہار جیسی نہ تھی، پھر بھی قدیم تھی، فارسی انشاء کا تتبع اب بھی کیا جاتا تھا، اس قسم کی ترکیبیں اکثر دیکھنے میں آتی ہیں، "راقم چٹھی، صاحب چٹھی، انتخاب ایک چٹھی، اجازت اندر جانے کی بی بیگم صاحب میٹھی تھی، چوں بجائے چونکہ، بحصولِ اجازت حکام واسطہ خرید نیلام اسباب لوٹ کے، چارج عہدہ جج کا تھا، وے وہ کی جمع، نسبت سابق صحت رکھتے ہیں، کراسپانڈنٹ بجائے نامہ نگار کے، بلا حصول پاس حاکم کے،" فقروں اور جملوں کو کسی قسم کے وقفوں کے نشانات سے جدا نہیں کرتے تھے، انگریزی املا کی صحت کا اسقدر خیال تھا کہ سپٹمبر اور ڈسمبر ہی لکھتے تھے، بمبئی میں "م" کی جگہ "ن" لکھتے تھے، اس زمانہ کی صحافت کی مدعا نگاری قابلِ تعریف تھی، وہ اپنا مطلب خوبی سے ادا کر لیتے تھے،

---

۱؎ خطبات گارساں دتاسی ص ۲۰ ۲؎ Cultural History of India ص ۱۵۳ ۳؎ اس دور کی خصوصیات پنڈت کیفی کے مضمون "اب سے آدھی صدی کے اردو اخبار" رسالہ اردو ۱۹۳۵ء اور Historical JOURNAL AND PYESS AFTER MUTINY سے ماخوذ ہے،



# تلخیص و تبصرہ

## راجہ ٹوڈرمل کے لڑکے

یو. پی. ہسٹاریکل جرنل کے جولائی ۴۲ء نمبر میں راجہ ٹوڈرمل کے لڑکوں کی نسبت ایک محققانہ مضمون شائع ہوا ہے، جس کی تلخیص حسبِ ذیل ہے:-

اکبر کے نامی گرامی وزیر ٹوڈرمل کے لڑکوں کے حالات بہت کم معلوم ہیں، لیکن پھر بھی ہمارے پاس مستند تاریخیں موجود ہیں جن سے اُن کی زندگی کے حالات کا علم ہو جاتا ہے، اکبر نامہ میں دھارو، گوردھن (غالباً گووردھن) اور کلیان داس کا ذکر ہے، ایک سنسکرت ڈرامہ کام سادھ مصنفہ سیشہ کرشن میں راجہ ٹوڈرمل کے ایک لڑکے کا نام گووندھاری بتایا گیا ہے، کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دھاری گووندھاری کا مخفف ہے، جس کو والدین نے پیار سے دھارو کر لیا ہے، اور یہی نام دونوں سے زیادہ مشہور ہے، بعض لوگوں نے غلطی سے دھارو اور گووندھاری کو ایک ہی سمجھ لیا ہے، اکھتریہ اتہاس کا مصنف تو ایک قدم اور آگے بڑھ گیا ہے، وہ گووندھاری کو بڑا بھائی کہتا ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ گووندھاری یا دھارو راجہ ٹوڈرمل کا بڑا لڑکا تھا، بیورج (Beveridge) کے اکبر نامہ میں صرف دو لڑکوں دھاری اور کلیان کا ذکر ہے،

اکبر نامہ میں دھارو کا سب سے پہلے ذکر اس وقت آیا ہے، جب فتح ڈھولکا جو ۲ر جون ۱۵۷۳ء

میں مرزا مظفر حسین اور مہر علی کے خلاف نصیب ہوئی تھی، وہ اس خبر اور منتخب ہاتھیوں کو گجرات سے دربار لیجانے کے لئے تعینات ہوا تھا، قیاس ہے کہ اس مہم میں اپنے باپ کے ساتھ ساتھ وہ بھی شریکِ جنگ تھا، جو کام اس کے سپرد تھا اس سے ظاہر ہوتا ہے، کہ یہ اس کی بہادری کا صلہ اور اس کی حوصلہ افزائی تھی، دوسری بار اس کا ذکر اس طرح آتا ہے، ۲۳ سنہ جلوس شاہی کا زمانہ تھا، عرب بہادر جو صوبہ بہار میں ترہت اور چمپارن کے درمیان خان اعظم سے شکست کھاکر جون پور کی طرف بڑھا آرہا تھا، اس کی سرکوبی کے لئے اکبر کے حکم سے اپنے باپ کی طرف سے بھیجا گیا تھا، گوردھن نے باغی کو پہاڑی علاقہ میں بھگا دیا، یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ جونپور میں مقرر ہوکر گیا تھا یا دربار آگرہ سے بھیجا گیا تھا، اکبر نامہ میں ایک جگہ لکھا ہے کہ شمشیر خاں ۲۴ سنہ جلوس شاہی کو بہار سے بنارس آیا تاکہ راجہ ٹوڈرمل کی فوجوں کو وہاں سے لے کر بہار کے باغی کو سر کرے، راجہ اس وقت دارالسلطنت میں تھا، اس لئے ممکن ہے کہ اس کا لڑکا عارضی طور پر بنارس میں یا مستقلاً جونپور میں مقرر ہو، ایک اور ثبوت یہ ہے کہ وہ اپنے باپ کی موت کے بعد جونپور سے دربار میں حاضر ہوا تھا اور ۳۴ سنہ جلوس شاہی سے غالباً وہ کئی سال تک جونپور ہی میں مقیم تھا، پانچ سال بعد ایک واقعہ کا اور ذکر ہے، جس سے یقین ہو جاتا ہے، کہ وہ جونپور کا حاکم تھا، وزیر خاں کے انتقال کے بعد شہباز خاں بنگال سے لوٹ رہا تھا تو اس نے وزیر خاں کے بیٹے صالح کو اس عہدہ پر مقرر کیا تھا، خود ۴۳ سنہ جلوس میں دربار میں حاضری کے لئے روانہ ہو گیا، اس کے جاتے ہی صالح کے دماغ میں بغاوت کا مادہ پکنے لگا، اور وہ موقع ڈھونڈھنے لگا، جب بادشاہ کو یہ معلوم ہوا تو اس نے میر مراد کو ضروری احکامات بھیجے، وہ اس وقت بہار اور بنگال کے امراء کا سزاول نامزد ہو کر بھیجا گیا تھا، اس نے وزیر خاں کے تمام سپاہیوں کو بھرتی کرنا شروع کیا، جو ان دونوں صوبوں کے امراء کی خدمت کے لئے تیار تھے، اور اس کا انتظام کیا کہ باقی سپاہیوں کی مدد سے صالح کو دربار میں



حاضر کر دیں، صالح کے تمام عذر لنگ مراد کے لئے قابلِ قبول نہیں تھے، وہ اپنے فرض سے واقف تھا، راستہ میں دغا فریب اور رشوت سے اس بات کی کوشش کی کہ افسروں کے اندر ایک انتشار پیدا ہو جائے، اور جب وہ جونپور پہنچا تو دھارو کو دھوکہ دینے میں کامیاب ہو گیا، مراد کی ہدایت کے مطابق صالح کے ساتھ ایک نگراں کا رہنا ضروری تھا لیکن راجہ کے لڑکے سے یہ چوک ہو گئی اور اس نے صالح کو بغیر کسی چوکیدار کے آگے بڑھنے دیا، راستہ میں اس نے خوب سیم و زر لٹائے اور بہت سے سپاہیوں کو اکٹھا کر کے میر کے علاقہ فتحپور ہنسوا کی طرف کوچ کر گیا، میر کو اس کی سازش کا پتہ چلا اور وہ قریب کے قلعہ میں پناہ گزیں ہو گیا، اس باغی نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا، اور اطراف میں لوٹ مار اور غارتگری شروع کر دی، ابو الفضل کہتا ہے:

"یک بیک قصبات اور دیہات کے جاگیرداروں کو اس ہنگامہ کی خبر ہوئی، اور وہ وہاں پہنچ گئے، سب سے پہلے آنے والوں میں اللہ بخش مورال تھا، جس نے اپنے ساتھ ایک اچھا فوجی دستہ بھی لایا۔"

اس کو گوندھاری نے جونپور سے بھیجا تھا، صالح فوراً گھر گیا اور دربار میں لایا گیا، اس واقعہ سے دھارو کی اپنی غلطی کے احساس اور اس کے بر وقت تدارک کی صلاحیت کا پتہ چلتا ہے، لیکن اس سے زیادہ یہ واضح ہوتا ہے کہ راجہ کا لڑکا اس وقت جونپور کا جاگیردار تھا، پھر یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ اسی زمانہ میں اس نے بنارس میں ایک تہوار کے تماشہ کو رونق بخشی تھی، جو بشیشر کے اعزاز میں ہوا تھا، ایک سنسکرت ڈرامہ کام سودہ" مصنفہ سیشہ کرشن" جو اسی کی سرپرستی میں لکھا گیا تھا، جب یہ ڈرامہ اس تہوار میں کھیلا گیا، تو وہ بھی شریک تھا، اس ڈرامہ کے شروع میں ایک اشلوک ہے جس میں اس کو راجہ گوردھن دھاری کے ارشاہیر سلطنت سے خطاب کیا گیا ہے،

۱۵۸۹ء میں دھارو جونپور میں تھا، اس سال کے آخر میں اس کے باپ کا انتقال لاہور
میں ہوا، اُس نے ہمیشہ کے لئے جونپور چھوڑ دیا، اور ۱۵۹۰ء کے وسط میں بادشاہ کے دربار میں حاضر
ہوا، اور اپنے باپ کے خادموں کو پیش کیا، اور خاطر خواہ انعام پایا، اسی سال مرزا عبدالرحیم
خانخاناں ملتان کا صوبہ دار مقرر ہوا اور مرزا جانی بیگ ترخان کے خلاف سندھ کی مہم پر مامور
کیا گیا، گوونددھارو جس کو بہادر اور خان کا خطاب مل چکا تھا، اپنے دستہ کے ساتھ خان خاناں
کی کمک کو پہنچ گیا، دھارو نے بہت ہی نمایاں خدمات انجام دیں اور دشمن کے ساتھ بہت
سی جنگوں میں بڑی بہادری سے لڑتا رہا، آخر کار اُس کی پیشانی پر ایک نیزہ لگا، اور وہ گھوڑے
سے گر پڑا، یہ بڑا کاری زخم تھا آخرش ۱۵۹۲ء میں ایک سچے سپاہی کی طرح بہادری سے لڑتے ہوئے
اس نے جان دیدی،

اس ہونہار نوجوان کے متعلق مشہور ہے کہ وہ اپنے گھوڑوں کو سونے کی نعل لگاتا تھا،
ابوالفضل کے بیان کے مطابق اس کا نام ہفت صدی سپہ سالاروں کی فہرست میں نظر آتا ہے،
اور اس کی ماہانہ تنخواہ قریب قریب آٹھ ہزار روپیہ تھی، اور اسکو ۶۰ ساٹھ گھوڑے، ۲۲ بائیس ہاتھی
اور ۴۶ چھیالیس باربرداری کے جانور رکھنے کی اجازت تھی،

راجہ ٹوڈرمل کے دوسرے لڑکے کلیان داس کو کہیں راجہ کلیان سنگھ اور کہیں راجہ کلیان مل
کے نام سے یاد کیا گیا ہے، اس دور میں کلیان بہت لوگوں کا نام تھا، اس لئے اس میں بہت کچھ غلطی ہو گئی
ہے، لاہور کے پروفیسر شرما نے یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ تزک میں راجہ کلیان سنگھ کو غلطی سے
راجہ ٹوڈرمل کا لڑکا بتلایا ہے، اپنے دعویٰ کے ثبوت میں تین دلیلیں پیش کی ہیں،

(۱) مآثر الامراء نے راجہ ٹوڈرمل کے کسی لڑکے کا یہ نام نہیں بتلایا ہے، اور نہ وہ کسی
ایسے لڑکے کا ذکر کرتا ہے، جو اتنا ممتاز ہو،



(۲) بہارستان غیبی نے راجہ مان سنگھ کے لڑکے کا نام کلیان سنگھ بتلایا ہے، اس کتاب سے یہ پتہ
چلتا ہے کہ کلیان سنگھ اپنے باپ کے ساتھ دربار میں حاضر ہوتا تھا،

(۳) مان سنگھ کا ایک لڑکا کلیان سنگھ تھا،

فاضل پروفیسر کو حیرت ہے کہ سرجدوناتھ سرکار نے کس طرح تزک کو تسلیم کر لیا، اور
بہارستان اور تزک کے اختلاف کو نظر انداز کر دیا، لیکن، افسوس ہے کہ پروفیسر مذکور کو یہ نظر نہ
آیا کہ سرجدوناتھ سرکار کی دلیلوں کی بنیاد زیادہ مضبوط ہے،

اگر مآثر میں راجہ ٹوڈرمل کے کسی لڑکے کا ذکر نہیں ہے، تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اس کے
کوئی لڑکا نہیں تھا، اکبرنامہ جو کہیں زیادہ بہتر اور قریب تر معاصرانہ تاریخ ہے نہ صرف اس کا
ذکر کرتی ہے، بلکہ راجہ ٹوڈرمل کے لڑکوں کے کارناموں کی بھی اس میں تفصیل ہے،

پروفیسر مذکور کی دوسری دلیل بھی کچھ زیادہ وزنی نہیں ہے، وہ شاید بھول گئے کہ ناتھن جس
پر انکو پورا بھروسہ ہے، اُنہوں نے بھی اپنی کتاب بہارستان غیبی چوتھے باب[18] اور پھر دسویں باب میں "راجہ
کلیان ولد ٹوڈرمل" لکھا ہے" یہ بھی قابل غور ہے کہ جہاں پر راجہ مان سنگھ کے لڑکے کلیان سنگھ
کا ذکر ہے، وہاں راجہ کا لفظ شامل نہیں ہے، یہ صحیح ہے کہ راجہ مان سنگھ کا ایک لڑکا کلیان سنگھ
تھا، لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ جہاں کہیں راجہ کلیان سنگھ کا نام آیا ہے، اس سے مان سنگھ کا
لڑکا ہی مراد ہو، جہانگیر کے وقت میں راجہ ٹوڈرمل کے لڑکے کا نام راجہ کلیان یا راجہ کلیان سنگھ
اور کبھی راجہ کلیان بھی لیا گیا ہے، اس کے علاوہ مان سنگھ نے بھاؤ سنگھ اور دوسرے مہا سنگھ (جگت سنگھ
کا لڑکا) دو ہی وارث مرتے وقت چھوڑے تھے، جگت سنگھ مان سنگھ کی زندگی ہی میں دنیا سے
کوچ کر گیا، اب یہ ممکن ہے کہ کلیان سنگھ جو بہت ہی کم مشہور ہوا، راجہ مان سنگھ کے دوسرے
لڑکوں کی طرح ان کی زندگی میں چل بسا ہو، اور یہ بالکل قطعی ہے، اس لئے کہ بھاؤ سنگھ کے بعد

وارثوں میں جگت سنگھ کے لڑکے کا نام نہیں آتا، جہاں تک راجہ ٹوڈرمل کے لڑکے راجہ کلیان سنگھ کا تعلق ہے ہمیں قطعی معلوم ہے کہ وہ راجہ مان سنگھ کی موت کے بہت بعد تک زندہ رہا، راجہ مان سنگھ کا انتقال ۱۰۲۳ھ مطابق ۱۶۱۴ء میں ہوا،

جب ہم راجہ کلیان کے حالات تزک اور اس کے ساتھ اکبرنامہ میں پڑھتے ہیں تو ان کے متعلق کوئی اشتباہ باقی نہیں رہتا، اکبرنامہ کے بیان کے مطابق کلیان داس ولد راجہ ٹوڈرمل کو اکبر کے انچاسویں سال جلوس میں ایک ہزاری اور پانچ سو گھوڑوں کا منصب عطا ہوا، تزک سے اس بیان کی تصدیق ہوتی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۶۱۱ء میں راجہ کلیان سنگھ کے منصب میں پانچسو ذات اور تین گھوڑوں کا اضافہ ہوا، جس نے اُن کے مجموعی منصب کو یکہزار و پانچ سو ذات، اور آٹھ سو گھوڑوں تک پہنچا دیا،

ابوالفضل نے سب سے پہلے کمایوں کے راجہ رودر اچند کی اطاعت کے سلسلہ میں ذکر کیا ہے بریلی کا کلکٹر متھرا داس اس راجہ سے ملا اور اُس نے اُس کو ترغیب دی کہ وہ اس کے ساتھ چل کر اکبر کو نذر عقیدت پیش کرے، راجہ رودر اچند کو اس کھتری کی ضمانت پر حاضر ہونے میں تامل ہوا لیکن ساتھ ساتھ اُس نے دربار میں حاضر ہونے کا وعدہ کیا، اگر راجہ ٹوڈرمل اسکی ضمانت لے لیں، اپنے بجائے ٹوڈرمل نے اپنے لڑکے کلیان داس کو بھیجدیا، تاکہ کمایوں کے راجہ کو اطمینان ہو جائے راجہ کلیان پر بھروسہ کرکے لاہور چلا گیا، اور ۱۵۸۸ء کے سرما میں اکبر کے دربار میں حاضر ہو گیا،

کلیان کا ذکر دوسری بار اکبر کے چھیالیسویں سال جلوس (۱۶۰۱-۲ء) میں ہوتا ہے، ابوالفضل نے لکھا ہے آٹھ بہمن کو شہنشاہ کو علم ہوا کہ چند بدطینت سرکشوں نے خراج وصول کرنا نہیں چھوڑا ہے بادشاہ نے چند معتبر اور سمجھدار آدمیوں کو اپنی حکومت میں روک تھام کے لئے مقرر کیا، ان میں ایک کلیان داس بھی تھا، اور گجرات کی راہیں اس کے سپرد ہوئیں،



اکبر کے انچاسویں سال جلوس میں اس کا نام ان امرا کی فہرست میں دسواں تھا، جن کے منصب میں اضافہ ہوا تھا، اکبرنامہ کا بیان ہے کہ کلیان داس ولد راجہ ٹوڈرمل کو ایک ہزار ذات اور پانچسو گھوڑوں کا منصب عطا ہوا، اور قلعہ کالنجر سپرد ہوا،

جہانگیر کے عہد میں راجہ کلیان بنگال بھیجا گیا جہاں سے اس نے بادشاہ کو تحائف بھیجے، جو ۸ محرم بروز دوشنبہ (غالباً ۲۴ مارچ ۱۶۱۱ء) کو بادشاہ تک پہنچے، اس کا اثر یہ ہوا کہ راجہ کلیان کے منصب میں پانچ سو ذات اور تین سو گھوڑوں کا اضافہ ہوا جس نے اُس کا منصب ایکہزار پانچسو اور آٹھ سو گھوڑوں تک پہنچا دیا،

۲۴ مئی ۱۶۱۱ء کو ایک حکمنامہ صادر ہوا جس سے ہاشم خاں صوبہ دار اڑیسہ کو کاشمیر تبدیل کر دیا گیا، ہاشم خاں اپنی نئی جگہ پر فوراً روانہ نہیں ہوا، غالباً اکتوبر کا مہینہ تھا کہ، سلام خاں کی سفارش "یکے از لائق خانزادان" پر کلیان کے منصب میں دو سو ذات اور گھوڑوں کا اضافہ ہوا، ایک شاہی جھنڈا ایک علم ایک شاہی نقارہ اور صوبہ اڑیسہ کی صوبہ داری عطا ہوئی اس صوبہ پر ۱۶۱۱ء سے لیکر ۱۶۱۷ء تک اُس نے حکومت کی، راجہ کیشو داس مارو نے خوردا (جو کہ اڑیسہ اور گولکنڈہ کی سرحد پر واقع تھا) کے والی پرشوتم دیو کو سخت شکست دی اور اُس کو مجبور کرکے بہت ہی ذلت آمیز شرائط صلح اس سے منوائیں لیکن بہت جلد اس صلحنامہ کے پرزے اُڑ گئے راجہ کلیان نے کیشو داس مارو کے ساتھ خوردا پر حملہ کر دیا، اس نے پرشوتم دیو کی ریاست کو غارت کر دیا، اور اس کو مجبور کر دیا کہ مارو کے شرائط صلح کو پھر تسلیم کرے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُس کو نہ صرف اپنا مشہور ہاتھی شیشا ناگا دربار میں اور تین لاکھ روپیہ خراج شاہی خزانہ میں داخل کرنا پڑا بلکہ اپنی لڑکی کو بھی شاہی حرم میں بھیجنا پڑا،

بعد میں راجہ کلیان کے خلاف کچھ نامناسب شکایتیں پہنچیں، جس کی وجہ سے وہ ۱۶۱۷ء

میں واپس بلایا گیا، اُس نے دربار میں حاضر ہونے میں دیر کی، اس سے اس کے دشمنوں کو موقع مل گیا اور اُنھوں نے بادشاہ کا دماغ اس کے خلاف بھر دیا، آخرش اگست کے آخر میں جب اس نے حاضری کی درخواست کی تو وہ اور اُس کا لڑکا آصف خاں کی حراست میں لے لئے گئے، اور آصف خاں کو حکم ہوا کہ مقدمہ کی تحقیقات کریں، ایک ہفتہ کے بعد اٹھارہ ہاتھی جو راجہ اڑیسہ سے لایا تھا اُن میں سے سولہ شاہی فیل خانہ میں داخل ہو گیے اور دو اس کو بخش کئے گئے، جب ایک ہفتہ اور گذر گیا، اور آصف خاں نے اپنی تحقیقات پیش کی کہ کلیان بے گناہ ہے، تب بادشاہ کے دربار میں حاضر ہونے کی اسکو اجازت ملی، اس موقع پر راجہ نے ایک سو مہر، ہزار روپیہ، موتیوں کا ہار جس میں اسّی موتی اور دو لعل تھے، اس کے علاوہ ایک مالا جس میں ایک لعل اور دو موتی تھے، اور ایک سونے کے گھوڑے کی مورت جو جواہرات سے لپی ہوئی تھی، پیش کی، بادشاہ نے نذر میں ایک خلعت اور ایک گھوڑا عطا کیا، بلکہ مہابت خاں کے دو سپہ سالاروں میں ایک اس کو بھی مقرر کیا، دوسرا راشد خاں تھا، مہابت خاں اس وقت کابل کا صوبہ دار بنا کر بھیجا گیا تھا، اور بنگش کو سر کرنے کے لئے مقرر ہوا تھا، کلیان کے متعلق اس سے زیادہ کچھ نہیں معلوم ہے۔

علی محمد خاں نے اپنی کتاب مراۃ احمدی میں ایک تیسرے لڑکے کا ذکر کیا ہے، اُس نے لکھا ہے کہ گوپی ناتھ ولد راجہ ٹوڈر مل سورت کے قریب کڑی کے شہر میں امن قائم کرنے کے لئے بھیجا گیا تھا، وہ اپنے اور دوسرے امرار جیسے راجہ سور کے دستوں کے ساتھ مالوہ کے راستہ سے وہاں پہنچا اور ملک کے اس حصہ میں بد امنی کا خاتمہ کر دیا، اس سے زیادہ اُس کے متعلق بھی کچھ معلوم نہیں ہے،

ا - ع

---



# اخبارِ علمیہ

## علی گڈھ سے عربی میں پہلا پی، ایچ ڈی

مسلم یونیورسٹی علی گڈھ نے عربی میں پی ایچ ڈی کی پہلی ڈگری سید محمد یوسف صاحب کو عطا کی ہے، یوسف صاحب دو سال سے علامہ عبد العزیز المیمنی کے تحت ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے، اور اسی یونیورسٹی کے فرسٹ کلاس فرسٹ ام اے ہیں،

سید یوسف صاحب کے مقالہ کا موضوع " المہلب بن ابی صفرۃ " ہے، اور ثائپ کے تین سو صفحات پر مشتمل ہے، المہلب اپنے وقت کا نامور ترین فوجی قائد تھا جس نے تیرہ سال کی مسلسل جنگ کے بعد ۷۸ھ میں خوارج کے سب سے زیادہ مفرط فرقہ ازارقہ پر فیصلہ کن فتح حاصل کی، یہ مشہور فتح اور اس کے علاوہ میدانِ کارزار میں مہلب کے دیگر کارنامے تاریخی روایات میں محفوظ ہیں، لیکن ابھی تک المہلب کے صحیح مقام کا تعین نہیں کیا گیا، مورخین نے ہنوز اس بات کی کوشش نہیں کی کہ المہلب کے کارناموں کی اہمیت کا اندازہ لگائیں اور اس کے مکمل نظام جنگ اور تدبیرِ حرب کے مخصوص طریقوں کا مطالعہ کریں، اس مقالہ میں یہی کوشش کی گئی ہے کہ المہلب کے فوجی کارناموں کو اُن کے مناسب تاریخی ماحول اور وقتی حالات کے پس منظر میں پیش کیا جائے، اور یہ اندازہ لگایا جائے کہ عربوں کے فنِ حرب کی ترقی میں المہلب کا کیا حصہ ہے،

اسلامی تاریخ کے اصلی اور قدیم ماخذوں میں کافی مواد ملتا ہے، جس سے المہلب کی عسکری زندگی

کی مکمل داستان بنائی جاسکتی ہے، اور اس کی قیادت اور تدبیرِ جنگ کی امتیازی خصوصیات کا تجزیہ
مطالعہ کیا جاسکتا ہے، لیکن خالص تاریخی ماخذ المہلب کی زندگی کے دوسرے پہلوؤں پر روشنی ڈالنے
سے قاصر ہیں، المہلب کے کارنامے صرف میدانِ کارزار تک محدود نہیں، اس کے ذاتی خصائل
بالخصوص جود و سخا اتنی ہی شہرت رکھتے ہیں جتنی کہ اس کی فتوحات، اس کی نفاستِ طبع اور ادبی
ذوق پر اس کے مقولے اور اس کی تحریریں گواہ ہیں، (جو بطور ضمیمہ مقالہ کے آخر میں شامل ہیں)
اسی طرح اسکا شاعرانہ ذوق اور شاعر نوازی کا تذکرہ ایک علٰحدہ باب چاہتا ہے، ان سب امور کیلئے
ادبی کتابوں اور معاصر شعراء کے دیوانوں کی ورق گردانی کرنی پڑتی ہے، اس مقالہ کی یہی سب سے
بڑی خصوصیت ہے کہ اس میں تاریخی ماخذوں کے علاوہ ادبی مصادر سے پوری پوری مدد لی
گئی ہے، اور جہاں کہیں بھی نثر میں خواہ نظم میں، المہلب کا حوالہ پایا جاتا ہے، اس کا تحقیقی مطالعہ
کیا گیا ہے،

---

جہاں تک فنِ حرب کا تعلق ہے المہلب کا طرۂ امتیاز اس کی مطاولۃ اور مراوغہ کی پالیسی ہے
وہ جلد فیصل ہو جانے والی لڑائیوں کے بجائے طویل جنگ کو ترجیح دیتا تھا، صبر آزما محاصروں کے
ذریعہ دشمن کی اقتصادی طاقت کو فنا کرنا اور مکائد و حیل سے مخالف جماعت میں تشتت و انتشار پیدا
کرنا اس کا سب سے کارگر حربہ تھا، یہ طریقۂ جنگ اس زمانہ کے لئے ندرت رکھتا تھا، یہاں تک کہ بہت
سے لوگ اس کے سمجھنے سے بھی قاصر تھے، ازارقہ کے خلاف تیرہ سال کی مسلسل جنگ اس لحاظ سے
غیر معمولی اہمیت رکھتی ہے، اس جنگ میں المہلب کی کامیابی اس کے معاصرین کی ناکامی کے مقابلہ میں
اور زیادہ نمایاں نظر آتی ہے اور اس کا مخصوص طریقۂ جنگ صاف واضح ہو جاتا ہے،

المہلب کی زندگی اس لحاظ سے بھی دلچسپ ہے کہ وہ پہلا عرب جنرل تھا، جس نے ۴۴ھ میں شمال
مغرب سے ہندوستان پر حملہ کیا، المہلب کا ذکر رواۃ حدیث میں بھی ہے،



سید یوسف صاحب کے مقالہ کے تین ممتحنین تھے، جن کی رپورٹ سے اقتباسات ذیل میں درج
کئے جاتے ہیں :-

۱۔ ڈاکٹر ڈی ایم ڈانلڈسن (ہنری مارٹن اسکول آف اسلامک اسٹڈیز)

"یہ مقالہ اہم ترین عربی ماخذوں سے ریسرچ کا ایک نہایت مکمل نمونہ ہے، یہ قابلِ تحسین
صحت وصفائی کے ساتھ تیار کیا گیا ہے، یہ حد درجہ دلچسپ ہے، اس لئے کہ اس کا اندازِ بیان راست
و صریح اور پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے"

۲۔ ڈاکٹر عظیم الدین احمد ایم، اے، پی، ایچ، ڈی (پٹنہ)

"مسٹر یوسف نے اس مقالہ کے ہیرو المہلب کو ہر ممکن نقطۂ نظر سے پیش کیا ہے، اور
ساتھ ہی ایک ایسا پس منظر بھی فراہم کیا ہے جس سے ہیرو کی تصویر اور زیادہ موثر اور فطرت کے
مطابق نظر آتی ہے، انھوں نے بکھرے ہوئے مواد کو جمع کرنے اور اس کو ایک مکمل دلچسپ اور پڑھنے
کے قابل تصنیف کی صورت میں ڈھالنے کے لئے بڑی محنت اٹھائی ہے، اور جو مواد بھی ان کو ملا اس کو
بڑی ہنرمندی اور تنقیدی نظر سے جانچا ہے، جہاں کہیں انھوں نے مانے ہوئے علماء سے اختلاف
کیا ہے، وہاں اپنے اختلاف کے وجوہ بیان کئے ہیں، جو اکثر صورتوں میں واجب التسلیم ہیں، اپنے
بیان کو حدِ امکان تک جلی اور مکمل بنانے کے لئے انھوں نے ایسی کتابوں کی بھی ورق گردانی کی ہے
جن کا تاریخ سے کوئی تعلق نہیں، مثلاً عربی شعراء کے کلام کے مجموعے، مسٹر یوسف نے اسلامی تاریخ
کے ایک قدیم، تاریک اور پُرفتن دور کے وقائع کو اس فن کے پیشرو حضرات کی بہ نسبت بہتر ترتیب
کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی ہے، اور بڑی حد تک اپنی کوشش میں کامیاب بھی ہوئے ہیں"

۳۔ مولانا عبدالعزیز المیمنی صدر ادارہ عربی مسلم یونیورسٹی:-

"رسالہ میں مہلب کو محض ایک شریف عرب یا ایک آزمودہ کار جنرل اور قائد اکبر کی حیثیت

ہی میں پیش نہیں کیا گیا، بلکہ یہ اس کے جملہ مجلسی خصائص، طبعی مکارم اور خداداد جواہر کا ایک ہمہ گیر مرقع سامنے لا رکھا ہے، جس میں مہلب کے دربار میں اس عہد کے نامی شاعر اور قبائلی وفود آتے ہیں اور اپنی منہ مانگی مرادیں پاکر پلٹ جاتے ہیں، یہ اور اسی قسم کی اور خوبیاں ہیں، جو اسلامی قائدین کے سوانح نگار بہت کم دکھاتے ہیں، جس سے غیروں کو اُن کی زندگی محض قتل و غارت کے مناظر کا مجموعہ نظر آتی ہے"۔

"سید یوسف صاحب نے مختلف دواوین شعراء و مجامیع ادبیہ سے اس عہد کی تاریخ کے علمی، ادبی اور تاریخی ریزے چن چن کر اُن کو تاریخی حقائق کی صف میں لاکھڑا کیا ہے، اور اس طرح موجودہ تاریخ کے بیانات کے تسلسل میں ان کو جہاں جہاں خلا نظر آیا اس کو اپنے من گھڑت سے نہیں بلکہ اپنی عرق ریزی اور ریزہ چینی سے نہایت سلیقہ کے ساتھ پُر کیا ہے"۔

"میں یونیورسٹی کو مبارکباد دیتا ہوں کہ اسکی چار دیواری میں علمی مواد کی کمی کے باوجود ایسا رسالہ تیار کیا گیا جو ہندوستانی بلکہ بیرونی یونیورسٹیوں کی تاریخ میں بھی مخصوص امتیاز کا حامل ہے"

## زمین دوز شہر

لندن کا ایک محلہ جو گولہ باری سے تباہ ہو گیا تھا، اب اس میں ایک زمین دوز شہر ایک سو فٹ کی گہرائی میں آباد کیا جا رہا ہے، جس میں ۳۵ ہزار آدمیوں کے رہنے کی گنجائش ہوگی، اور وہ گولوں اور گلا گھونٹنے والی گیس سے محفوظ رہیں گے، یہ شہر ان لوگوں کی حفاظت کے لئے مخصوص ہوگا، جن کی حفاظت خود سلطنت کی حفاظت خیال کیجاتی ہے، کیونکہ یہ لوگ یا تو خود اہمیت رکھتے ہیں یا اون کے کارنامے اہم ہیں، اس شہر میں دوکانیں، رسٹوران اور شفاخانے وغیرہ سب ہونگے، اور کئی ملین ٹن اینٹ اور پتھر اس نئے شہر کی تعمیر کے لئے زمین کے اندر سے نکالے گئے ہیں،



# ادبیات

## مقدمِ ماہِ صیام

از جناب یحییٰ اعظمی

صد شکر کہ رحمت کا مہینہ نظر آیا      مومن کے لئے وجہِ سکینہ نظر آیا

وہ ماہ ہوا جس میں درِ فیضِ ازل باز      انوارِ الٰہی کا خزینہ نظر آیا

بڑھتے ہوئے طوفانِ ضلالت میں جہاں کو      عرفان و ہدایت کا سفینہ نظر آیا

ظلمت کدۂ دہر کی تاریک فضا میں      ہر سمت تجلی کا قرینہ نظر آیا

خود چشمِ کواکب کا اشارہ ہے کہ یہ ماہ      ایام کے خاتم کا نگینہ نظر آیا

اذکار سے پُر نور عبادات سے معمور      ہر بندۂ اللہ کا سینہ نظر آیا

راتیں ہوئیں تسبیح و تراویح سے آباد      وہ ذوقِ عبادات شبینہ نظر آیا

ہے چشمِ تصور میں "قم اللیل" کا منظر      نظارۂ سرکارِ مدینہ نظر آیا

توحید کے میخانے ہیں یا صحنِ مساجد      عابد کے کفِ دست میں مینا نظر آیا

وارفتگیِ شوق میں سجدوں پہ ہیں سجدے      پُر کیف عجب دورِ شبینہ نظر آیا

ہر سمت ہے پھیلی ہوئی مہتاب تجلی      ہر گوشہ تماشا گہِ سینا نظر آیا

حق یہ ہے کہ اس ماہ کا ہر لحظۂ اقدس      بامِ فلکِ قدس کا زینہ نظر آیا

صدقے میں ہی جس کے ہیں دولتِ کونین

مژدہ کہ وہ پُر نور مہینہ نظر آیا

## سجدہ گہ افلاک

از جناب روش صدیقی

اتنا تو نہوتا تھا اے وحشتِ دل بیباک
میرا بھی گریباں چاک انکا بھی گریباں چاک

ہر پردۂ ساز اس سے ہی شعلہ بہ پیراہن
خاموشیٔ الفت ہے وہ نغمۂ آتشناک

اک بربطِ بے نغمہ اک ساغرِ بے بادہ
جو دل نہیں بشکستہ جو آنکھ نہیں نمناک

معمورۂ امکاں میں جو کچھ ہے محبت ہے
کونین کی قیمت کیا انبارِ خس و خاشاک

جو پائے محبت نے کھائی تھی جہاں ٹھوکر
وہ نقشِ قدم اب تک ہے سجدہ گہ افلاک

خاکِ رہِ الفت ہے اک سرمۂ بینائش
اس خاک سے کرتے ہیں انجم بھی نگاہیں پاک

دیکھو تو روشؔ بڑھکر کیا حضرتِ زاہد ہیں
یہ کون سبو لیکر بیٹھا ہے بزیرِ تاک

## غزل

از جناب حسرت ترمذی بی اے ال ال بی

خضرِ راہِ محبت میں مجھے کام نہ تھا
میں وہ آزاد ہوں جو بندۂ اوہام نہ تھا

انقلاب اور بھی تھے عشق میں حسرت کے سوا
کیا غمِ عشق کا ظالم کوئی انجام نہ تھا

دیدۂ جلوہ نگر کو ترے جلووں کیلئے
حرم و دیر و کلیسا سے کوئی کام نہ تھا

ہے وہ درد جو دل سے نہ گیا جیتے جی
آہ وہ دل جسے اک لمحے کو آرام نہ تھا

انتہا یہ ہے کہ ہمکو نہ رہی اپنی خبر
ابتدا وہ تھی کہ اندیشۂ انجام نہ تھا

ہمکو وہ پاسِ وفا تھا کہ ترے غم کے سوا
عشق میں کوئی شریکِ دلِ ناکام نہ تھا

حسن کو اہلِ ہوس نے کیا رسوا کیا کیا
جلوۂ طور تماشائے سرِ بام نہ تھا

تمکو رسوائی حسرت بھی گوارا کیسے
عشق بدنام ہے کیا حُسن بھی بدنام نہ تھا



# مطبوعاتِ جدیدہ

**سلطان محمود غزنوی**، از جناب محمد حبیب صاحب بی اے (آکسن) پروفیسر تاریخ مسلم یونیورسٹی، ناشر ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد، حجم ۱۳۸ صفحے تقطیع چھوٹی، لکھائی چھپائی ٹائپ میں،

سلطان محمود غزنوی، اسلامی تاریخ میں دورِ شہنشاہیت کا بانی سمجھا گیا ہے، "سلطان" کا لقب پہلی مرتبہ اُسی نے اختیار کیا، پروفیسر محمد حبیب اسکی سیرت، کردار، اور کارناموں کے متعلق اپنے چند خاص نظریات رکھتے تھے، جن کو مدت ہوئی وہ اپنے مختلف مضامین میں پیش کر چکے تھے، اور اسی زمانہ میں ان خیالات پر مخالف و موافق مضامین نکل چکے تھے، پھر عرصہ ہوا اُنھوں نے انہی نظریات کی روشنی میں انگریزی زبان میں محمود پر ایک مستقل کتاب لکھی، اور اس پر بھی بعض اہلِ علم کی طرف سے مفصل تنقید اسی زمانہ میں شائع ہو چکی ہی، اب جناب سید جمیل حسین صاحب ایم، اے (حیدر آباد سول سروس) نے اس کتاب کو سلیس اردو زبان میں منتقل کیا ہی، جو ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد کی طرف سے شائع ہوئی ہے، یہ کتاب چار بابوں میں تقسیم ہے، پہلے باب میں دسویں صدی عیسوی کی اسلامی دنیا پر نظر ڈالی ہے، جس میں حکومتوں کی سیاسی تقسیم، عالم اسلامی پر خلفاء کے ذہنی اقتدار، چھوٹی خاندانی حکومتیں، ان کی خانہ جنگیاں، اور خلفاء سے اُن کے تعلقات، مسلمانوں کی مذہبی جماعتیں اور اُن کے اختلافات، اور مسلمانوں کے درمیان نسلی تفوق کے رجحانات کو تفصیل سے دکھایا ہے، دوسرا باب سلطان محمود کے عہدِ حکومت پر ہے، جس میں غزنوی سلطنت کی بناؤ تاسیس دکھا کر مشرقی و مغربی ملکوں پر محمود کے حملوں اور فتوحات کو یکے بعد دیگرے سلسلہ وار

بیان کیا ہے، اس سلسلہ میں ہندوستان پر محمود کے حملوں کا ذکر خاص طور پر آیا ہے، تیسرا باب محمود کے کارناموں کی نوعیت و اہمیت پر ہے، اس میں مصنف نے محمود کے متعلق اپنے ذاتی رجحانات و نظریات کو خاص طور پر بیان کیا ہے، اور اسی ضمن میں محمود کے دور کی تمدنی و علمی ترقیوں کا ذکر آیا ہے، مصنف کا خیال ہے کہ محمود ایران کی ادبی نشاۃ جدیدہ کا بانی ہے، اس کے عہد میں مذہبی سرگرمی تقریباً ناپید اور ایک باجبروت شاہنشاہی کی ہوس پیدا ہو چکی تھی، اس نئی روح سے ایک نئی تہذیب کے ارتقار میں مدد ملی، اور رزم و بزم دونوں میں نفاست و خوشنمائی کا ماحول پیدا ہوا، محمود ایران کی ادبی نشاۃ جدیدہ کا ایک عظیم الشان مربی بنا، علم و ادب کی سرپرستی کی، اور اس کی ترقی کے مواقع پیدا کئے، اس کے بعد اس کے حملوں اور فتوحات کے متعلق دکھایا ہے کہ اس کا مطمحِ نظر سراسر دنیاوی اور ایرانی تھا، اس نے اپنی سپہ گری کے جوہر سے دنیا کو حیرت میں ڈالنے والی فتوحات حاصل کیں، ہندوستان پر اس کے حملے حکومت قائم کرنے یا اسلام کی اشاعت کرنے کی غرض کے بجائے صرف تحصیلِ زر کے لئے تھے، غزنوی فوج مجاہدین پر مشتمل نہ تھی جو مذہب کی خاطر جہاد کے لئے آمادہ ہوئی ہو، بلکہ وہ ماہرینِ فن کی ایک تربیت یافتہ تنخواہ دار فوج تھی، جو ہندو اور مسلمان دونوں سے یکساں لڑنے کی عادی تھی، اس نے محمود کے ہاتھوں ہندوستان کے مندروں کی بربادی خالص دنیاوی اغراض کے تحت عمل میں آئی، چوتھے باب میں غزنوی سلطنت کے زوال اور خاتمہ کو دکھایا گیا ہے، کہ محمود اپنی فتوحات سے جو کچھ حاصل کر سکا، اس کو قائم رکھنے کی صلاحیت نہ رکھتا تھا، اس کے آنکھیں بند کرتے ہی ناخلف مسعود کے ہاتھوں غزنوی شاہنشاہیت کا خاتمہ ہو گیا اور وہ ایک چھوٹی سی سلطنت بن کر رہ گئی، جس کو ابتداءً سلجوقیوں نے برباد کیا، پھر چند صفحوں میں سلجوقیوں کے عروج و زوال کی طرف اشارہ کرنے کے بعد دکھایا ہے کہ بارہویں صدی کے وسط میں غزنوی سلطنت و سلجوقی شہنشاہیت دونوں کا خاتمہ ہو گیا، اور ان کی جگہ غور اور خوارزم کی حکومتوں نے لی اور



اسی پر اس کتاب کا خاتمہ کیا گیا ہے، سلطان محمود کے متعلق پروفیسر محمد حبیب کے مختلف تاریخی نظریات و رجحانات میں سے اگر بعض محلِ نظر ہیں تو بعض قرینِ صحت بھی ہیں، لیکن مصنف نے کہیں کہیں محمود کی ذات و کردار کے متعلق جو ناملائم، درشت، تلخ اور ایک غیر جانبدار مورخ کی شان سے فروتر لب و لہجہ اختیار کیا ہے، ہم اس کو ان خوش عقیدہ مسلمان مورخین کے خوشگوار لب و لہجہ کا ردعمل قرار دے سکتے ہیں، جنھوں نے محمود کو سراپا راہِ خدا کے مقدس مجاہد اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے نقشِ قدم کے مخلص متبع کے لباس میں پیش کیا ہے، اس لئے اب مستقبل کا کوئی مورخ ہی اس افراط و تفریط کے درمیان کوئی راہِ صواب پا سکتا ہے،

**فتح مبین**، مرتبہ جناب حاجی محمد موسیٰ خاں صاحب رئیس دتاؤلی، علی گڈھ، حجم ۲۹۲ صفحے، تقطیع ۱۸×۲۲، لکھائی چھپائی اچھی، قیمت درج نہیں، پتہ دار الریاست دتاولی ضلع علی گڈھ۔

مصنف نے تحریکِ خلافت کے زمانہ میں "اسلامی خلافت کا کارنامہ" کے نام سے ایک تصنیف شائع کی تھی، مصنف کے نزدیک خلافت سے مراد مذاہبِ عالم کی دعوتیں ہیں، جو اپنے اپنے وقتوں میں کرۂ ارض پر تہذیب و تمدن کی بانی رہیں، اور ان کے مصلحانِ تہذیب اصطلاح میں نبی یا رسول کہے گئے، اسی لحاظ سے اسلامی حکومت سے مراد اسلام کا وہ "عظیم الشان ادارہ" ہے، جس نے دنیا میں تہذیب و تمدن کی کبھی نہ بجھنے والی شمع روشن کی، اور جس کی مکمل عملی تصویر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک میں ملتی ہے، اسی مناسبت سے مصنف نے پہلی جلد میں آنحضرت صلعم کی سیرت پاک کے مختلف پہلو پیش کئے اور زیر نظر حصہ میں جس کو "فتح مبین" سے موسوم کیا ہے، سوانح پاک کے بقیہ حصے درج کئے، اس جلد میں صلحِ حدیبیہ سے وصالِ نبوی تک کے حالات درج ہیں، اور مختلف ابواب میں سیرت پاک سے ہویدا ہونے والے مختلف تمدنی، تہذیبی و اخلاقی آثار کو اپنے سابقہ تبصروں کے روشن کر کے دکھایا ہے، اس کا مطالعہ مسلمانوں کے لئے سودمند ہو گا،

**عہد نبوی کا نظام تعلیم**، از جناب ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب استاذ جامعہ عثمانیہ، حجم ۴۰ صفحے، تقطیع ۲۲×۲۰ لکھائی چھپائی اچھی، قیمت عہ ناشر ادارۂ ترقی تعلیم اسلامی، حیدرآباد دکن۔

جناب ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب، جامعہ عثمانیہ میں قانون بین الممالک کے استاذ ہیں، اور ہندوستان کے ان چند ذی علم میں سے ہیں، جن کی طرف وسعتِ نظر صحتِ تخیل، فکرِ صحیح اور ذوقِ تحقیق و جستجو کے لحاظ سے نگاہ اٹھتی ہے، موصوف کی نظر عہد نبوی کے بین الاقوامی تعلقات پر خاص طور سے ہے اور "وثائقِ نبویہ" پر ایک ضخیم تصنیف شائع کرا چکے ہیں، وہ وقتاً فوقتاً مختلف عنوانوں سے ہند و بیرون ہند کے ممتاز رسائل میں اپنے نتائجِ فکر پیش کرتے اور معلومات میں اضافہ اور اہلِ علم سے خراجِ تحسین وصول کرتے رہے ہیں، معارف کے ناظرین بھی موصوف کے وقیع مقالات سے فائدہ اٹھاتے آئے ہیں، زیر نظر مقالہ "عہد نبوی کا نظامِ تعلیم" بھی پہلی مرتبہ معارف ہی میں شائع ہوا تھا، اور ناظرین معارف کو جیسا کہ معلوم ہے، اس میں عہد نبوی کے نظامِ تعلیم پر تفصیل سے نگاہ ڈالی گئی ہے، اب اس کو خاص اہتمام سے ہاتھ کے بنے ہوئے کاغذ پر حیدرآباد کی علمی مجلس "ادارۂ ترقی تعلیم اسلامی" کی طرف سے رسالہ کی صورت میں شائع کیا گیا ہے، اہلِ علم اپنے ذوق کی تسکین کے لئے اس کو رسالہ کی اس شکل میں بھی منگا کر اپنے پاس رکھ سکتے ہیں،

**عربی حبشی تعلقات**، از جناب ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب استاذ جامعہ عثمانیہ، حجم ۲۴ صفحے، تقطیع ۲۲×۲۰ لکھائی چھپائی اچھی، قیمت ۸؍ ناشر ادارہ ترقی تعلیم اسلامی، حیدرآباد دکن،

یہ رسالہ بھی جناب ڈاکٹر حمید اللہ صاحب موصوف کا ایک مقالہ ہے، اور جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، اس میں عربی حبشی تعلقات پر نظر ڈالی گئی ہے، اور آخر میں ایک نو دریافت شدہ



نامۂ نبوی بنام نجاشی کو ضمیمہ کے طور پر منسلک کیا گیا ہے، جو ابھی جنوری ۱۹۴۰ء میں لندن کے رسالہ جے آر اے ایس میں شائع ہوا تھا، اس نامۂ مبارک کا عکس بھی شائع کیا گیا ہے، یہ رسالہ بھی دبیز دستی کاغذ پر چھاپا گیا ہے،

**دیوان جوشش**، مرتبہ قاضی عبدالودود صاحب تقطیع چھوٹی ضخامت معہ مقدمہ ۴۰۰ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت ؏ پتہ انجمن ترقی اردو ہند نئی دہلی:

محمد روشن جوشش عظیم آبادی میر اور مرزا کے دور کے صاحب دیوان اساتذہ میں تھے، لیکن ان کے کلام کو وہ شہرت نہ حاصل ہوئی جس کے وہ مستحق تھے، تذکروں میں بھی ان کے حالات بہت کم اور بہت مختصر ملتے ہیں، ان کا دیوان مدت ہوئی شائع ہوا تھا، لیکن اس میں صحت وغیرہ کا اہتمام نہ تھا، اب اردو زبان کے ممتاز خدمت گذار جناب قاضی عبدالودود صاحب بیرسٹر پٹنہ نے قلمی اور مطبوعہ نسخوں کی مدد سے بڑی محنت اور قابلیت سے یہ دیوان اڈٹ کیا ہے، دیوان کے شروع میں مرتب کے قلم سے ایک مبسوط مقدمہ ہے، جس میں مختلف تذکروں سے جوشش کے حالات نقل کرنے کے بعد خود مرتب نے بھی حالات لکھے ہیں، اور جوشش کے کلام پر نہایت مبسوط اور ناقدانہ تبصرہ کیا ہے، دیوان کی تصحیح اور کلام کے ہر جہتی تبصرے بلکہ تجزیہ و تحلیل میں صحت اور تبصرہ نگاری کا پورا حق ادا کیا گیا ہے، لیکن اختصار پسندی اور رموز و اشارات کی کثرت کی وجہ سے مقدمہ کا بڑا حصہ چیستاں بن گیا ہے، جس کو سمجھنے کے لئے بڑی دقت اٹھانی پڑتی ہے، اگر مرتب نے رموز کنایات کے بجائے تحریر میں تھوڑی سی فیاضی سے کام لیا ہوتا، تو ناظرین دماغی الجھن اور زحمت دونوں سے بچ جاتے، ہر شخص کو اتنی فرصت کہاں کہ وہ ہر ہر سطر بلکہ ہر ہر لفظ کے حوالے الٹ کر دیکھتا پھرے،

**بت تراش**، از جناب اشتیاق حسین قریشی، ناشر مکتبہ جامعہ دہلی، حجم ۴۴ صفحے،

تقطیع چھوٹی، لکھائی چھپائی اچھی، قیمت ۴ر

یہ ایک مختصر ڈراما ہے، جس میں ایک بت تراش کے تیار کئے ہوئے مرد و عورت کے دو مجسموں کے ذریعہ سے تمثیل کے طور پر ان میں جان ڈال کر اس سوال کو حل کیا گیا ہے کہ خالقِ کائنات تعالیٰ نے صرف اچھے رجحانات اور خیر ہی خیر کو کیوں نہ پیدا کیا، تمثیل اپنے رنگ میں دلچسپ ہے،

**تاریخ کی تعلیم**، مصنفہ ڈبلیو ایم رابرٹن، ایم اے پرنسپل کریچین ہائی اسکول کھرڑ، ضلع انبالہ، مترجمہ مسٹر ایس ایس مسیحی بی اے، ہائی اسکول کھرڑ ضلع انبالہ، حجم ۶۲ صفحے، تقطیع چھوٹی، خط باریک قیمت ۳ر مصنف سے طلب کریں،

اس رسالہ میں ابتدائی مدرسوں میں چھوٹے بچوں کو فن تاریخ پڑھانے کے طریقے بتائے گئے ہیں، جس میں چند ابواب میں تاریخ پڑھانے کے مقاصد، معلم کے اوصاف، پڑھانے کے طریقے اور اچھے سبق کے خصوصیات وغیرہ سمجھائے گئے ہیں، معلمین کے لئے رسالہ کا مطالعہ مفید ہوسکتا ہے،

**بچوں کا تحفہ**، از جناب محمد شفیع الدین صاحب نیر، حجم ۸۰ صفحے، تقطیع چھوٹی، کاغذ بہتر، لکھائی چھپائی، اور سرورق بچوں کے مناسب، قیمت ۸ر مصنف سے موڈرن ہائی اسکول نئی دہلی کے پتہ سے طلب کریں،

یہ بچوں کی دلچسپی کے لئے نظموں کا ایک گلدستہ تیار کیا گیا ہے، زبان آسان، عام فہم اور خیالات سادہ ہیں، نظمیں ایسے عنوانوں اور چیزوں پر لکھی گئی ہیں، جو بچوں کے گرد و پیش اور عموماً علم میں رہتی ہیں، بچے ان نظموں کو دلچسپی اور شوق سے پڑھیں گے،

**دیس کی لیلا**، از جناب میاں عبدالمجید صاحب بھٹی قیمت ۸ر پتہ ہونہار بک ڈپو، ریلوے روڈ لاہور

یہ بھی بچوں کے لئے گیتوں کا ایک مجموعہ ہندی آمیز زبان میں تیار کیا گیا ہے نظموں کا موضوع حب الوطنی ہے، بڑی عمر کے بچے جو ہندی زبان بھی کچھ سیکھ لیں، وہ اس سے زیادہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں، "ر"

جلد ۵۰ ماہ شوال المکرم ۱۳۶۱ھ مطابق ماہ نومبر ۱۹۴۲ء عدد ۵

## مضامین